"PROF. ABDUL MUGHNI KI IQBAL SHANASI"

A dissertation submitted to the University of Hyderabad in partial fulfillment of the requirement of the award of degree of

MASTER OF PHILOSOPHY

IN URDU

Submitted

By

Md. Noor Ahmed Noor

Reg.No:17HUHL24

Under the Supervision
Of
Dr. A. R. MANZAR

Department of Urdu, School of Humanities
University of Hyderabad
Hyderabad 500 046

2019

پروفیسر عبدالمغنی کی اقبال شناسی

(تحقیقی مقالہ برائے ایم۔فل)

2019

مقالہ نگار:

محمد نور احمد نور

ریسرچ اسکالر: یونی ورسٹی آف

حیدرآباد

نگراں:

ڈاکٹر عبدالرب منظر

ایسوسیٹ پروفیسر، شعبۂ اردو

یونیورسٹی آف حیدرآباد

شعبۂ اردو، اسکول آف ہیومانٹیز

یونی ورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد، تلنگانہ 500046

2019

Department of Urdu,
School of Humanities,
University of Hyderabad.
Hyderabad - 500 046.

DECLARATION

I, **Md. Noor Ahmed Noor**, hereby declare that this dissertation entitled **"PROF. ABDUL MUGHNI KI IQBAL SHANASI"** submitted by me under the guidance and supervision of **Dr. A. R. Manzar**, is a bonafide research work which is also free from plagiarism. I also declare that it has not been submitted previously in part or in full to this University or any other Institutions for award of any degree or diploma. I hereby agree that my thesis can be deposited in shodganga/INFLIBNET.

Date:

Name: Md. Noor Ahmed Noor

Signature of the Student

Regd. No: 17HUHL24

CERTIFICATE

This is to certify that the Dissertation entitled **"PROF. ABDUL MUGHNI KI IQBAL SHANASI"** submitted by **MD. NOOR AHMED NOOR** bearing registration number **17HUHL24** in partial fulfilment of the requirement for the award of degree of **Master of Philosophy** in **Urdu** is a bonafide work carried out by him under my supervision and guidance.

This Dissertation has not been submitted previously in part or full to this University or any other University or Institution for the award of any degree or diploma.

He has presented an article in the following conference ''Sir Saiyad Ahmad Khan ki Elmi-o- Adabi Khidmat'' presented in one day National Seminar on 25th February 2018. {Copy of the certificate enclosed}

Signature of the Supervisor

Countersignature

Head of the Department

Dean
School of Humanities

فہرست

پیش لفظ		1
بابِ اول	پروفیسر عبدالمغنی، سوانح اور شخصیت	5
بابِ دوم	پروفیسر عبدالمغنی کی تنقید نگاری: ایک جائزہ	37
بابِ سوم	پروفیسر عبدالمغنی کی اقبال شناسی	103
اختتامیہ		145
کتابیات		151

پیش لفظ

اللہ جل وشانہٗ کے نام سے شروع جونہایت رحم والا ہے سب تعریفیں اس خدائے برتر کے لیے جس نے بنی نوع انسان کووہ بتایا جووہ نہیں جانتا تھااوراس کواشرف المخلوقات کے مرتبے پر فائز فرمایا،اسی رب کریم کی بارگاہ میں شکر بجالاتا ہوں جس نے مجھے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت عطا کر تحقیقی کام کرنے کا اہل بنایا۔

کروڑوں درود وسلام اس محبوب خداﷺ پر جس نے ہمیں علم توحید کی روشنی دیکر گمراہی کی تاریکیوں سے باہر نکالا جس کی نسبت سے ہم افضل الامت قرار پائے۔

اردوزبان وادب کا کوئی طالب علم ایسا نہیں بلکہ جواردوزبان سے واقف ہوا قبال اوران کی شاعری کا مداح و گرویدہ نہ ہو۔ جب بچپن میں مجھے نظم ’’بچے کی دعا‘‘،’’پرندے کی فریاد‘‘،’’پہاڑ اور گلہری‘‘،’’ترانۂ ہندی‘‘ وغیرہ پڑھایا گیا،تو کلام اقبال کی سوز وگداز ،موسیقیت وموزونیت نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ کلام اقبال کی دلکشی ہی میرے اردوزبان کے طالب علم ہونے کا محور بھی ہے اوراعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا محرک بھی۔

اسکول کے زمانے سے ہی مطالعۂ اقبال پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ایم۔فل کے دوران جب میرے سامنے موضوع کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو میں نے سوچا اپنا دیرینہ پسندیدہ موضوع اقبال واقبالیات پر اپنا تحقیقی کام کروں۔ میں نے اپنے نگراں ڈاکٹر عبدالرب منظر صاحب سے اس کا ذکر کیا انھوں نے اپنے مشوروں سے نوازتے ہوئے کہا ! کہ اقبال پر تحقیقی کام اتنا ہو چکا ہے کہ اس کا کوئی گوشہ میری نظر میں باقی نہیں رہا۔لہٰذا اقبال کے جو ناقدین ہیں انھیں ناقدین میں سے کسی ایک پر تحقیقی کام کیا جا سکتا ہے۔اس طرح میرے نگراں نے اپنے استاد محترم پروفیسر بیگ احساس سے ذکر کیا تو انھوں نے میرے موضوع کو اس طرح سے متعین کیا۔

بالآخر اپنے استاد محترم ونگراں کی مدد سے ’’پروفیسر عبدالمغنی کی اقبال شناسی‘‘ میرے مقالے کا موضوع قرار پایا۔

مقالے کی تیاری اور مواد کی فراہمی یقیناً ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔لیکن میرے نگراں واساتذہ کی رہنمائی و رہبری نے میرے کام کو آسان بنا دیا جنھوں نے مواد کی فراہمی کے سلسلے میں اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازا۔

زیرِنظر مقالہ تین ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

باب اول: پروفیسر عبدالمغنی۔۔''سوانح اور شخصیت'' ہے۔اس باب میں پروفیسر عبدالمغنی کا مختصر تعارف، خاندانی پس منظر، پیدائش، تعلیم وتربیت، درس وتدریس کے تعلق سے حتی المقدور معلومات فراہم کیا گیا ہے، اور بعض واقعات کو نظر انداز کیا گیا ہے، شخصیت، ادبی خدمات، نظریۂ ادب، نظریۂ تنقید، تصانیف، پروفیسر عبدالمغنی مشاہیرین ومعاصرین کی نظر میں ہیں اس کے تعلق سے نام چین معاصرین سے گفتگو کی گئی ہے، عہدے اور اعزازی عہدے، اعزازات وانعامات وغیرہ کو قلم بند کیا گیا ہے۔جب کہ اس میں دیگر رسائل وجرائد سے استفادہ کرتے ہوئے مزید ان کے صاحبزادے سے معلومات حاصل کر کے نئی بات کو لیا گیا ہے۔

باب دوم: پروفیسر عبدالمغنی کی ''تنقید نگاری'' ایک جائزہ ہے۔اس باب میں پروفیسر عبدالمغنی کی تنقید نگاری کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور ان کی تنقیدی تصانیف کا یکے بعد دیگرے جائزہ مع اہم مقالات کا تنقیدی تجزیہ کیا گیا ہے۔یہ باب میرے مقالے کا اصل موضوع نہیں ہے تاہم اس پر گفتگو کرنی اس طرح لازم سمجھا کہ اس کے بغیر مقالہ ادھورا معلوم ہو رہا تھا۔اس کے اضافے عبدالمغنی کے تنقیدی رجحان کو سمجھنے میں آسانی ہو اس لیے اس باب میں اجمالی طور پر ان کی تنقیدی تصور کو جگہ بہ جگہ اپنی بساط کے مطابق لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔مزید اس باب میں تنقیدی کتابوں کی اہمیت کو پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے جہاں تک ہو سکا ہے میں نے اس کی تنقیدی کتابوں کا ببلیوگرافی کے طور پر مضامین کی فہرست دے دی ہے۔

باب سوم: پروفیسر عبدالمغنی۔۔کی ''اقبال شناسی'' کے عنوان سے ہے۔یہ میرے مقالے کا اہم باب اور میرا موضوع ہے اس لیے اس باب کی اہمیت اصل اصیل ہے اس باب میں پروفیسر عبدالمغنی کے وہ تمام مضامین اور تمام کتابیں جو اقبال کی شاعری، اقبال کی فکر، اقبال کی فلسفیانہ منھ شگافیوں وغیرہ سے اچھی خاصی اپنی بساط بھر بحث کی گئی ہے۔پروفیسر عبدالمغنی کی اس طرح اقبال پر لکھنے کی وجہ اور اس کی عرق ریزی سے دل چسپی لینے کی وجہ کو بھی بیان کیا گیا ہے۔پروفیسر عبدالمغنی کے زمانے میں مشہور ناقدین اقبال سے بھی استفادہ کیا گیا ہے مثلاً خلیفہ عبدالحکیم اور یوسف حسن خان کلیم الدین احمد وغیرہ سے گفتگو کی گئی ہے۔بالخصوص عبدالمغنی نے کلیم الدین کے

اعتراضات جوانھوں نے اقبال ایک مطالعہ اوراردوشاعری پرایک نظروغیرہ کے مطالعہ سے اقبال کے کلام کی فن و ہیئت سے متوجہ ہوتے ہیں ان سب سے کلام کرنے کی راقم نے کوشش کی ہے بہرحال عبدالمغنی نے اقبال کے فن کو کافی انہاک اوردل چسپی سے مطالعہ کیا ہےاس کے مطالعہ کرنے میں انھوں نے فلسفہ،فکروفن کے ساتھ ساتھ قرآنی رموز، اسلامی واقعات اور بزرگان دین کے ملفوظات وغیرہ کومطالعہ بھی کیا۔اس باب میں اقبال کےفکروفن کے حوالے سے پروفیسرعبدالمغنی کی تنقیدنگاری کا جائزہ لیا گیاہے۔

اختتامیہ: میرے مقالے کا آخری حصہ اختتامیہ ہےجس میں پروفیسرعبدالمغنی کی تنقیدی امتیازات کوپیش کیا گیاہے،آخرمیں کتابیات،رسائل وجرائدکی فہرست شامل ہے۔

میں اپنےنگراں ڈاکٹرعبدالرب منظرصاحب کا بےحدممنون ہوں جنھوں نے میرامقالے کی تکمیل میں ہر قدم پررہنمائی فرمائی۔میں شعبۂ اردو کےصدرمحترم پروفیسرحبیب نثارصاحب وشعبے کے دیگرتمام اساتذۂ کرام کا مشکور ہوں جنھوں نے میرے تحقیقی سفرمیں سنگ میل کا کام کیا۔اور پروفیسر بیگ احساس صاحب کاشکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے ایم۔فل میں درس دیااورمیرے مقالے کاموضوع متعین کر کےمیری دل چسپی بڑھائی۔

میں اپنے والدین ماجدین مرحومین کا ذکرنہ کروں تو یہ ناشکری ہوگی کہ جنھوں نے میری اچھی تربیت کرنے میں کوئی بھی دقیقہ نہیں اٹھائے رکھا، مجھےعلم حاصل کرنے کے مواقع عطاکیےاوراعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی ذہن سازی کی۔افسوس کہ وہ آج اپنے لگائے ہوئے پھل داردرخت کودیکھنے کے لیے موجودنہیں ہیں مگرمیری اللہ سبحانہٗ تعالیٰ سے دعاہے کہ وہ اس کا اجرجزیل عطافرمائے۔میں اللہ کریم رؤف الرحیم کی بارگاہ میں دعا گوہوں کہ اللہ جل شانہٗ میرے والدین کی قبروں پربطفیل نبیٔ کریم ﷺ رحمت وانوارکی بارشیں عطا فرمائے اوران کواس کا بہترصلہ عطا فرمائے۔آمین

خدابخش لائبریری پٹنہ، بہارگورنمنٹ (اردو)لائبریری اوراندراگاندھی میموریل لائبریری یونی ورسٹی آف حیدرآباد سے مجھے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے موقع ملا۔جناب فخرالدین عارفی کا میں بےحدشکرگزارہوں کہ انھوں نے موادکی فراہمی کے سلسلے میں ہرممکن تعاون فرما کر مجھے پروفیسراحمدمسعود(فرزنداکبرپروفیسرعبدالمغنی) سے بلاواسطہ تعارف کرایااورپھرپروفیسراحمدمسعودصاحب نے میرے موضوع سے متعلق ہدیتاً کئی کتابیں عنایت کیں۔

میں سلطان آزاد صاحب کا شکر بھی گزار ہوں جنھوں نے میرے موضوع کے مواد کی کئی کتابوں تک رسائی کرائی۔

میں اپنے بھائیوں، بہنوں کا فرداً فرداً شکریہ ادا کرتا ہوں، خصوصیت کے ساتھ حافظ نور الفتاح نور، غلام حسنین نور صاحبین کا جنھوں نے میری ضرورتوں کو بر وقت پورا کیا اور سایۂ پدری کے نہ ہونے کا احساس نہ ہونے دیا۔

جن اصحاب کی بنا پر میرا یہاں تک پہنچنا ممکن ہو سکا ان میں میرے عزیز دوست شمس آغاز کا بے حد ممنون ہوں، جنھوں نے میری منقطع تعلیمی سلسلہ کو جاری رکھنے میں رہنمائی کی۔ نیز میں اپنے مشفق دوست محمد رضا قادری، نواب مرزا حیات نوری و نسبتی برادرِ اصغر شیخ محمد انور اور میرے دیرینہ عزیز دوست شیبہ مرزا کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے میری ہمت افزائی کی۔

اخیر میں شعبۂ اردو کے جملہ احباب خصوصاً میرے رفقائے عزیز محمد نسیم امانتی، نور عالم خان کا متشکر ہوں جنھوں نے میرے مقالے کی تیاری میں ہمیشہ دست تعاون دراز رکھا۔

اللہ جل شانہٗ انھیں اپنے مقاصد میں کامیابی اور سلامتی عطا فرمائے۔ آمین

جون، 2019

راقم الحروف

MH-K روم نمبر 01

محمد نور احمد نور

ساؤتھ کیمپس،

ریسرچ اسکالر

حیدرآباد

یونی ورسٹی آف حیدرآباد، تلنگانہ

﴿باب اول﴾

پروفیسر عبدالمغنی: سوانح اور شخصیت

پروفیسر عبدالمغنی کا مختصر تعارف

پروفیسر عبدالمغنی ایک بلند پایہ نقاد، بہار اردو تحریک کے سپہ سالار اور اردو کو بہار کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلانے میں ان کا مرکزی کردار رہا ہے۔ان کو اردو،عربی، فارسی، انگریزی چاروں زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ ان کی علمیت اور ذہانت غیر معمولی تھی۔ان کی پیدائش صوبۂ بہار ضلع اورنگ آباد میں 4 جنوری 1936 میں ہوئی۔ ان کا پورا نام ''ابوالمبر دسید عبدالمغنی'' ہے لیکن ادبی دنیا میں عبدالمغنی کے نام سے مشہور ہوئے۔ان کی ابتدائی تعلیم والد ماجد کی نگرانی میں مدرسہ اسلامیہ اورنگ آباد میں ہوئی۔ 1960ء میں پٹنہ یونی ورسٹی سے انگریزی ادب میں M.A کیا اور پھر وہی سے T.S ELIOT'S CONCEPT OF CULTURE کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر PH.D کی ڈگری حاصل کی۔ پٹنہ میں اردو بھون کی تعمیر انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ پروفیسر عبد المغنی چھ بار انجمن ترقی اردو بہار کے صدر رہ چکے ہیں۔ 1968 میں انھوں نے انجمن ترقی اردو بہار کے ترجمان کی حیثیت سے ایک ماہنامہ ادبی رسالہ ''مریخ'' کے نام سے جاری کیا۔ جو ادبی تحقیق کی دنیا میں دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

انھیں زمانۂ طالب علمی سے ہی لکھنے پڑھنے کا شوق تھا انھی دنوں مختلف رسائل میں مضامین لکھنے لگے تھے۔ان کے مقالات ہندو پاک کے معیاری رسائل میں کثرت سے شائع ہوتے رہے۔ پروفیسر عبدالمغنی کی تصانیف کی تعداد تقریباً پچاس پر پہنچتی ہے۔تنقید کے میدان میں انھوں نے نمایاں کارہائے نامہ انجام دیے۔ پروفیسر عبدالمغنی کی گیارہ تنقیدی تصانیف مل کر ایک نئی تنقید فکر اور شعور کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔جس ہم مشرقی تنقید و اخلاقی تنقید کے نام سے جانتے ہیں۔انھوں نے اقبال پر معتدل مقالات اور مستقل کتابی بھی لکھے ہیں۔اقبال اور عالمی ادب، اقبال کا نظام فن ،''اقبال کا نظریۂ خودی، اقبال کا ذہنی وفنی ارتقا، اقبال دی پوئٹ (انگریزی)، تہذیبوں کا تقابلی مطالعہ فکر اقبال کی روشنی میں وغیرہ اقبالیات پر معیاری کتب تصنیف کیں ہیں۔ بقول شبّر امام ''ڈاکٹر صاحب کا ویسے تو کوئی خاص موضوع کا تعین کرنا مشکل ہے مگر اقبال اور اقبالیات کو اگر کہا جائے ڈاکٹر صاحب کا خاص موضوع ہے تو بے جا نہ ہوگا''۔

اقبال اور عالمی ادب کلیم الدین احمد کی کتاب ''اقبال ایک مطالعہ کا جواب کے ساتھ ساتھ اردو تنقید اور

اقبالیات میں ایک لائق ستائش علمی اضافہ ہے، یہ تصنیف عالمی ادب میں اقبال کا مقام کے تعین اور خصوصاً مغربی شعرا کے ساتھ اقبال کا موازنہ ومحاکمہ کا بہترین نمونہ ہے۔یہی وہ شاہکار تصنیف ہے جو پروفیسر عبدالمغنی کو ماہرین اقبالیات کی فہرست میں شامل کرتا ہے۔

خاندانی پس منظر:

ان کے والد مولانا حافظ سید عبدالرؤف ندوی قاضی شہر کے منصب پر فائز تھے والدہ کا نام وکیل النساء تھا اپنے وقت میں ضلع اورنگ آباد (بہار) کی سب سے تعلیم یافتہ خاتون تھیں،اور شاعری کا ذوق بھی رکھتی تھیں۔ نانا سید شاہ یحییٰ سہسرام کی مشہور خانقاہ کے سجادہ نشین تھے جن کی تولیت میں شیر شاہ سوری کا مقبرہ تھا۔ کہاجاتا ہے کہ ان کے جدامجد وہ شاہ بڈھا،ان کا شمار فتویٰ عالمگیری کے مرتبین میں ہوتا ہے۔جن کا دستخط فتویٰ عالم گیری پر ہے۔

پیدائش:

پروفیسر عبدالمغنی کی پیدائش صوبہ بہار کے ضلع اورنگ آباد میں 4 جنوری 1936 کو ایک علمی ومذہبی گھرانے میں ہوئی۔ان کا پورا نام ابوالمبر دسید عبدالمغنی ہے لیکن ادبی دنیا میں عبدالمغنی کے نام سے مشہور ومقبول ہوئے۔

تعلیم وتربیت:

پروفیسر عبدالمغنی کی ابتدائی تعلیم ان کے والد ماجد کی نگرانی میں مدرسہ اسلامیہ اورنگ آباد میں ہوئی۔ 1949 میں بارہ برس کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ پٹنہ آگئے یہاں انھوں نے مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے درجہ ؟ مولوی میں داخلہ لیا۔1953 میں بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے مولوی امتحان میں اول پوزیشن حاصل کیا اور پھر عالم کی سند حاصل کی۔دوران طالب علمی میں مدرسہ کے پرنسپل مولانا ریاست علی ندوی سے اختلاف کی بناپر مجبوراً مدرسہ شمس الہدیٰ کو چھوڑ ناپڑا اور تب انھوں نے ضلع اسکول گیا بہار شریف سے پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے میٹرک کا امتحان دیا اور ممتاز نمبروں سے کامیابی حاصل کی اس کامیابی سے ان کے حوصلے بلند ہوئے اور انھوں نے پٹنہ یونی ورسٹی آرٹس فکلٹی کے انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لیا۔بی۔اے کے لیے انھوں نے انگریزی کا انتخاب کیا۔1960 میں انھوں نے پٹنہ یونی ورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ 1961 میں بی۔پی۔

ایس۔سی (بہار پبلک سروس کمیشن) کے ذریعے منتخب ہوکر پٹنہ یونی ورسٹی کے ماتحت بی۔این کالج میں انگریزی ادب کے لیکچرر کی حیثیت سے ملازم ہوگئے۔ دوران ملازمت 1978 میں انھوں نے پٹنہ یونی ورسٹی سے ہی T.S.Eliot's Concept Of Culture کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یہ تحقیقی مقالہ 1986 میں کتابی شکل میں شائع ہوکر اہل علم ودانش سے کافی دادو تحسین حاصل کیا۔

درس وتدریس:

1961 میں بی۔پی۔ایس۔سی سے منتخب ہوکر پٹنہ یونی ورسٹی کے بی۔این کالج میں شعبہ انگریزی کے لکچرر ہوئے۔ بعد میں ریڈر اور پھر ترقی کرکے پروفیسر کے عہدے سے بھی سرفراز ہوئے اور آخری وقت تک وہ انگریزی ڈپارٹمنٹ میں پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیئے۔

شخصیت:

پروفیسر عبدالمغنی ایک ذہین پارسا فرد تھے ان پر ان کے والد مولانا عبدالرؤف کی تعلیم وتربیت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ چناں چہ عبدالمغنی زمانۂ طالب علمی سے ہی ظاہری وباطنی دونوں اعتبار سے صاف گو کھرے بلکہ بعض اوقات کھرے اور احساس برتری سے سرشار ہو جاتے انھیں زبان پر قدرت حاصل تھی جب کبھی وہ بولتے سامعین ایسا محسوس کرتے گویا کہ القاء ہو رہا ہو۔تحریر کی طرح تقریر اور ساتھ ہی گفتگو بھی نہایت منظّم ومربوط انداز میں کرتے اس کی مثال زمانۂ طالب علمی کے ایک فی البدیہہ تقریری مقابلے سے ہوتا ہے:

> ''عبدالمغنی کا نام پکارا گیا اسٹیج پر ہی انھیں کاغذ کا ایک بند ٹکڑا دیا گیا مسکراتے ہوئے اسے کھولا اور چند سکینڈ توقف کے بعد بہار کی چند اہم تاریخی شخصیات کے موضوع پر روانی کے ساتھ بلند آواز سے بولنا شروع کر دیا۔۔۔۔محترم حضرات و سامعین کرام! عہد قدیم سے آج تک یوں تو بہار میں ایک سے ایک اہم
>
> شخصیات کے کارنامے تاریخ میں انمٹ ہیں مگر محض نو منٹ کے اندر سب پر اظہار خیال کے بجائے میں محض چند شخصیات ہی پر کچھ اشارے کرسکوں گا مشہور محقق اور عالم دین مولانا مناظر احسن گیلانی کے بقول:

''بھارت کے علمی وفکری اور تمدنی وتہذیبی عروج کی ابتدا مگدھ دیس (بہار شریف یا نالندہ، راج گیر، پاداپوری، حاجی پور، گیا وغیرہ) سے شروع ہوتی ہے اور شیخ عبدالمغنی محدث اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمہ کے لفظوں میں بلدۂ بہار مجمع علما تھا''۔

مورخین گواہ ہیں کہ مولانا محی الدین فیضی بہاری عرف ملا موہن اورنگ زیب عالم گیر کے اتالیق تھے اور قاضی محبّ اللہ بہاری نے داراشکوہ کو تعلیم دی تھی۔ پھر معمولی سے وقفے کے بعد موصوف نے پانچ اہم ترین موضوعات کے ذیل میں تین تین اہم ترین شخصیات کا ذکر کیا۔

(1) مذہبی رہنماؤں میں گوتم بدھ، مہاویر جین اور حضرت مخدوم شرف الدین بہاری مؤخرالذکر کے بارے میں بتایا کہ اہل علم حضرات جانتے ہیں کہ پورے ہندوستان میں صحیحین کی تعلیم شروع کرنے والے بہار کے شیخ شرف الدین یحییٰ منیری تھے۔

(2) سیاسی شخصیات میں مہاراجہ اشوک، شیر شاہ سوری اور ڈاکٹر راجیند ر پرساد کے نام گنائے۔

(3) اردو کے محققین میں نواب علی ابراھیم خان (مصنف گلزار ابراھیم) قاضی عبدالودود اور پروفیسر حسن عسکری کے نام یاد دلائے۔

(4) ناقدین کی فہرست میں نواب امداد امام اثر صاحب (مصنف کاشف الحقائق)، عبدالغفور شہباز اور اپنی موجودہ پرنسپل پٹنہ کالج جناب کلیم الدین احمد کے نام نامی پیش کیا۔

(5) اردو شعرائے کرام میں راسخ عظیم آبادی، شادؔ عظیم آبادی اور استاد گرامی علامہ جمیل مظہری کا تذکرہ کیا۔ اور اپنی پر جوش اور منظّم تقریری صلاحیت کی بنا پر الین مقرر قرار پائے''۔(1)

مزکورہ بالا اقتباس سے ان کی اعلیٰ تقریری علمی وادبی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

پرفیسر احمد سجاد سابق ڈین فیکلٹی آف ہیومانی ٹیز رانچی یونی ورسٹی پروفیسر عبدالمغنی کے تعلق سے رقم طراز ہیں:

''میں اپنی یاد میں دو افراد کو پچاس برسوں تک اس طرح دیکھا کہ کبھی کسی

سے مرعوب نہ ہوئے بلکہ اپنے گفتار و کردار سے دوسروں کو مرعوب کیا''۔(2)

پروفیسر عبدالمغنی نیک اور شریف انسان تھے ان کے دل میں اردو زبان کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی قوم وملت کا درد بھی رگ و ریشے میں پیوست تھا۔ انھوں نے اردو کو اس کا حق دلانے کے لیے حکومت و سیاست دوانوں سے لڑائیاں لڑیں، اپنی تقریروں اور تحریروں سے حکومت وقت اور اردو والوں کو اردو کے مسائل سے باخبر کیا، جرأت و بے باکی کے ساتھ ایوان حکومت میں اپنی باتیں رکھیں اور کبھی مرعوب نہیں ہوئے۔ ان کی اسی جرأت و بے باکی کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔

> ''8 جنوری 1989 کو تاریخی شہر بہار شریف میں انجمن ترقی اردو بہار کی آل بہار اردو کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت پروفیسر عبدالمغنی کیے تھے کانفرنس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے وزیر اعلیٰ ستیندر نارائن سنہا شریک تھے۔ ان کی موجودگی میں پروفیسر عبدالمغنی نے اپنی تقریر میں بڑی مضبوطی کے ساتھ اردو کے مسائل رکھے اور بھرے مجمع میں یہ کہہ دیا کہ ''1980 میں اردو کی سرکاری حیثیت کا قانون منظور ہونے اور 1981 میں اس کا نفاذ شروع ہونے کے بعد پچھلے 8 سال میں حکومت نے اردو آبادی کے مسائل کے حل کے لیے کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا ہے۔ خود قانون اردو کے نفاذ میں مشکلات ہو رہی ہیں۔۔ یہاں تک کہ ملازمین اردو کی شرح تنخواہ تک میں ضروری اضافہ نہیں ہوا ہے اور اقلیتی تعلیمی ادارون کو وقت پر پوری تنخواہ اور دیگر سہولتیں دیگر اداروں کے برابر نہیں مل رہی ہیں۔ لہذا اگر حکومت نے اردو بولنے والوں کے مسائل حل نہیں کیے تو وہ انتخاب کے موقع پر اپنا جمہوری حق استعمال کرتے ہوئے کانگریس کو ووٹ نہیں دیں گے''۔(3)

اس تقریر نے وزیر اعلیٰ ستیندر نارائن سنہا کو جھنجھوڑ دیا اور وزیر اعلیٰ کے حکم سے 20 دنوں کے اندر 29 جون 1989 کو 11 اضلاع میں اور 16 اگست 1989 کو 13 اضلاع میں اردو کو سرکاری مراعات حاصل ہوگئیں۔

عبدالمغنی کی انانیت مشہور ہے وہ اپنی مزاجی کے خلاف کسی معاملے پر بھی مصلحت نہیں کرتے تھے گرچہ اس

میں ان کا جتنا خسارہ ہو جائے، خسارے کا انھیں کوئی غم ہوتا اور نہ کوئی پچھتاوا۔

ڈاکٹر سید احمد قادری ان کی انانیت کے متعلق لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر عبد المغنی کی انانیت بھی مشہور ہے وہ اچھے اچھوں کو خاطر میں نہیں لاتے خواہ وہ ادب کا ہمالہ ہو یا سیاست کا ایوریشٹ وہ ایک بار جو موقف اختیار کر لیتے ہیں اس میں پھر کسی بھی طرح کی تبدیلی کے لیے وہ تیار نہیں ہوتے اس ضمن میں ان کا کہنا ہے کہ وہ بہت سوچ کر کوئی رائے قائم کرتے ہیں پھر اس میں تبدیلی کا سوال کہاں''۔(4)

پروفیسر عبد المغنی کی پرورش دینی، مذہبی اور علمی ماحول میں ہوئی جس کی وجہ سے مذہب ان کی فطرت میں داخل تھا۔ وہ خود حافظ قرآن تھے، اندرا گاندھی کے دور میں جب ایمرجنسی لاگو کر دیا گیا اور آر۔ آر۔ ایس وغیرہ پر پابندی عائد کرنا چاہا تو اکثریتی آبادی کو خوش کرنے کے لیے توازن قائم کرنے کی غرض سے بلا جواز جماعت اسلامی ہند پر پابندی عائد کر دی، اس ہٹلری فرمان کے تحت ملک گیر پیمانے پر ارکان جماعت کی اندھادھند گرفتاریاں شروع ہو گئیں اور عالم گنج کی مسجد کے امام بھی اسی لپیٹ میں آ گئے۔ امام صاحب کی گرفتاری جو جگہ خالی ہوئی (خطبۂ جمعہ اور امامت) اسے عبد المغنی نے پوری قوت ایمانی کے ساتھ ادا کیا۔

اسلام پر لکچر دینا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا وہ اکثر اسلامی مجالس میں خطاب فرماتے اور اپنی پر دلیل تقریر کے ذریعے سامعین کو مطمئن کرتے۔

پروفیسر عبد المغنی کی طرز رہائش سادہ ہوا کرتی تھی۔ زیادہ تر ان کا وقت کتابوں کا مطالعہ میں گزرتا تھا۔ وہ سیاسی، سماجی ادبی، مذہبی ہر طرح کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ ان کے شب و روز کے کاموں کا وقت متعین ہوا کرتا تھا۔ وقت کے بہت پابند تھے۔ وضع داری ان کے رگ وریشے میں سمائی ہوئی تھی، وہ ماضی کی روایت کی پاسداری اپنا نصب العین سمجھتے تھے۔ وقت کی پابندی وہ اس حد تک کرتے کہ کبھی کبھی جلسہ گاہ میں وقت معینہ پر سامعین سے حال بھرا ہوا ہو نہ ہوں اس کی ذرا پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنا مقالہ پڑھنا شروع کر دیتے اور مقالہ ختم کر کے واپس ہو جاتے۔ اگر جلسہ کی صدارت کرنی ہو تو معین وقت پر حاضر ہو جاتے۔ وہ جلسہ گاہ کی منتظمین اور سامعین سے بھی اس بات کی امید کرتے کہ وہ بھی وقت کی پابندی کریں۔

پروفیسر عبدالمغنی کے مزاج میں حد درجہ نفاست تھی۔ وہ عام طور پر خوش ذائقہ اور لذیذ کھانا پسند کرتے تھے۔ مرغ و ماہی انڈا اور اس کے علاوہ عمدہ مٹھائیاں انھیں زیادہ پسند تھیں۔ وہ وقت کی پابندی کے ساتھ ناشتہ اور کھانا نوش فرماتے تھے۔

گورنمنٹ اردو لائبریری کے لائبریرین حسن احمد صاحب پروفیسر عبدالمغنی سے قریب رہنے والوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔انھوں نے پروفیسر عبدالمغنی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ بقول ان کے پروفیسر عبدالمغنی صاحب کو عام طور پر سردی زکام کی شکایت رہتی تھی شاید یہ الرجی کی وجہ سے ہوا کرتی تھی۔ وہ اکثر چھینا کا رس اور گلاب جامن ضرور کھایا کرتے تھے۔ وہ خوش خوراک اور خوش پوشاک بھی تھے۔ گوشت کی بنی چیزیں کوفتہ، کباب اور قورمہ ان کی پسندیدہ غذا تھی۔ مہمانوں کی ضیافت میں وہ اس کا خیال رکھتے۔ جاڑے کے موسم میں صبح کے وقت چائے کے ساتھ دو عدد ابلا ہوا انڈا ضرور تناول فرماتے اور چائے عموماً سادی پیتے تھے۔ پوشاک میں پرنس سوت زیادہ پسند کرتے تھے گرمی میں ادھی پہنتے۔ گھر پر لنگی، کرتہ گنجی ٹوپی کا بھی اہتمام کیا کرتے۔ قیام و طعام کی عادت کے سلسلے میں شبر امام بھی رقم طراز ہیں:

> ''اگر انہیں کسی نے مدعو کیا تو وہ میزبان کو اپنے قیام و طعام کے لیے پہلے سے صاف طور پر تاکیداً تحریر کر دیا کرتے اور اس میں وہ کسی قسم کی تکلفات کو دخل نہیں دیتے۔ اکثر و بیشتر ہمیں بھی ان کے پروگرام میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا جب وہ منزل مقصود پر پہنچے اور وہاں جو ان کیا ستقبال کے لیے آتا تو پہلے وہ اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے کہ آپ مجھے یہاں سے سیدھے وہاں لے چلیں جہاں ہمارے قیام کا انتظام ہے''۔(5)

صبح کو اپنے مقررہ وقت پر بیدار ہو جاتے۔غسل کے بعد نماز اور قرآن کی تلاوت ضرور کرتے اور اس کے بعد ناشتہ سے پہلے انگریزی اردو کی اخبار بینی کرتے۔ لباس میں کرتا پاجامہ مگر باہر نکلتے تو علی گڑھی پاجامہ کرتہ پر شیروانی اور ہم رنگ ٹوپی پہنتے تھے۔ سیمینار میں تو شیروانی اور پاجامہ ہی زیب تن کرتے۔ ابتدائی دور میں ملازمت بی۔ این۔ کالج میں بوشرٹ پہنتے تھے۔ پروفیسر عبدالمغنی ایک گداز دل اور بے قرار روح کے مالک تھے۔ اس کا اندازہ عام طور پر سفر کے دوران ہوا کرتا تھا جب وہ غالب اور اقبال کی غزلوں کو ترنم سے پڑھتے تھے۔ شبر امام اس کا ذکر

کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ڈاکٹرعبدالمغنی کی آواز میں درد اور ترنم ہے جب وہ کسی غزل کو پڑھتے تو دلکش انداز میں ادا کرتے اور ترنم بھری آواز میں پڑھتے۔

اقبال اور غالب کی غزل نظم کو اپنے اسی درد اور دلکش آواز پڑھتے ہیں۔۔۔۔ وہ زیادہ تر اقبال کی غزل ہماری فرمائش پر سناتے اور کبھی اپنی بے چین روح کو اسی طرح تسکین دیتے کئی بار ایسا بھی اتفاق ہوا ہے کہ کار سے تقریباً پورے بہار کا دورہ کیا جب کارنوادہ ضلع سے گزرتی اور پہاڑوں کی خوب صورت گھاٹیوں اور جنگلوں سے گزرتی تو وہ بل کھاتی پہاڑوں کی چوٹیوں اور آبشاروں کو غور سے دیکھتے اور کہتے کہ مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہماری روح ان کوہساروں میں سکون حاصل کرنے کے لیے بھٹک رہی ہے۔ وہ دریا کے کنارے کھڑے ہو کر کچھ دیر تک اس کی بے چین و بے تاب لہروں سے لطف اٹھاتے''۔(6)

پروفیسر عبدالغنی نے شاعری بھی کی وہ اقبال سے حددرجہ متاثر تھے۔ وہ شعرگوئی کے فن سے خوب خوب واقف تھے لیکن اس کا کھل کر اظہار کرنا اپنے کو ایک خودساختہ معیار سے گرانا غلط گرانا سمجھتے تھے۔ مشہور طنز مزاح نگار شاعر رضا نقوی واہی کی زبانی اس ضمن میں ایک واقعہ ملاحظہ کیجیے:

''عبدالغنی صاحب کی شعرگوئی کا سراغ مجھے بڑے ڈرامائی انداز میں ملا تھا کوئی بیس برس قبل کی بات ہے ہم دونوں ایک ادبی تقریب میں شرکت کی غرض سے رانچی گئے تھے۔ واپسی پر ٹرین کے کمپارٹمنٹ میں ہم دونوں کے علاوہ کوئی اور ہم سفر نہیں تھا جب گاڑی کھلی تو مغنی صاحب نے فرمایا کہ آیئے اپنے کچھ اشعار سناتا ہوں پھر جیب سے نوٹ بک نکالی اور بڑی خوش الحانی سے غزلیں سنانے لگے۔ اشعار صاف ستھرے اور بڑے جاندار تھے۔ مجھے ان کی طبیعت کا یہ رخ معلوم نہیں تھا اس لیے حیرت اور مسرت کی ملی جلی کیفیت میں ڈوب کر کلام سنتا رہا جب وہ جی بھر سنا چکے تو مجھ سے ملتجیانہ انداز میں کہنے لگے کہ میں ان کی شاعری کا تذکرہ کسی اور سے نہ کروں۔ مجھے ان کی اس ادا پر بھی مجھے سخت حیرت

ہوئی کیوں کہ عموماً جب شاعر ایک یا دو غزل لکھ لیتا ہے تو اس پر اشعار سنانے کا دورہ پڑتا ہے۔۔۔۔۔ لیکن عبد الغنی صاحب ایسے حضرات سے مختلف نکلے''۔(7)

میری تلاش میں ایک غزل یا نظم شائع کسی رسائل و جرائد میں دریافت نہ ہو سکا۔کمال یہ ہے کہ رضا نقوی واہی کے علاوہ ان کے معاصرین دوست واحباب میں کسی نے بھی ان کی شاعری کا ذکر نہیں کیا ہے۔

پروفیسر عبد المغنی کی طرز زندگی بہت سادہ تھی وہ پر تکلف زندگی نہیں گذراتے تھے ان کی طرز رہائش کی تصویر کشی کرتے ہوئے شبر امام اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''میں حیرت اور خاموشی سے گفتگو بھی سن رہا تھا اور بار بار ڈاکٹر عبد الغنی کی طرف بھی دیکھتا اور ان کی رہائشی کمرے کا جائزہ لے رہا تھا ایک مختصر سا کمرہ جس کی چھت عام چھتوں سے نیچی ایک مسہری بچھی اس پر سفید چادر ایک تکیہ اسی کے بغل میں چھوٹا ٹیبل اور ایک طرف کونے میں اس سے کچھ بڑا ٹیبل جس پر کتابوں اور پرچوں کا انبار دو دعدد گدے دار کرسی بچھی تھی مسہری کے دوسری جانب ایک گودریج کا المیر ا ایک لکڑی کا ہنگر اور دیوروں میں دو عدد ایک نما الماری سمنٹ کی بنی جس پر بھی کتابوں اور اخباروں کا ڈھیر لگا تھا۔کمرے کے ایک کونے میں صراحی جس پر گلاس رکھا ہوا اور ایک طرف جوتے اور چپل پڑے تھے مسہری کے سرہانے کی جانب جائے نماز رکھی اور ایک دو کتاب پڑی تھی۔دیواروں پر ایک دو کلنڈر اور سپاس نامہ فریم میں جھول رہا تھا۔میں کمرے کا تنقیدی جائزہ لے رہا تھا اور بار بار یہ سوچتا کہ آج ہمارے بھائی زیدی صاحب کو بھی مذاق سوجھا اور وہ کسی غلط جگہ پر مجھے لے آئے ہیں''۔(8)

پروفیسر عبد الغنی کی شخصیت کی تصویر کشی کرتے ہوئے مشہور طنز و مزاح نگار شاعر اور ان کے قریبی دوست رضا نقوی واہی رقم طراز ہیں:

''ڈاکٹر عبد المغنی کی ذات بابرکات ایک ایسی کثیر المقاصد خود کار مشین ہے جس میں لاتعداد بٹن دباتے جائیے ان کی مختلف النوع تصویریں نظر آتی جائیں

گی مدرسہ شمس الہدیٰ کے فارغ التحصیل یونی ورسٹی میں ریڈر اور انگریزی کے استاد، بہار انجمن ترقی اردو کے صدر، کوئی موضوع ہو قلم برداشتہ تحریر یا برجستہ تقریر کرنے میں ماہر، سیاسی پلیٹ فارم ہو یا محفل میلا د رمضان المبارک میں محلے کی مسجد میں تراویح پڑھانی ہو یا نمازیوں کی امامت کرنی ہو۔ ادبی سیمینار میں حصہ لینا ہو یا مشاعرہ کی صدارت کرنی ہو ہر جگہ حاضر، اردو کا مسئلہ ہو یا مسلم پرسنل لا کے وفد کے ساتھ وزیر اعلی سے مل رہے ہیں۔ انگریزی اور اردو اخبارات میں دھڑا دھڑ بیان چھپوا رہے ہیں۔ تنظیمی صلاحیت ایسی کی انجمن ترقی اردو جو کبھی روایتی شاعر کے معشوق کی کمر کا درجہ رکھتی تھی آج اردو کی وکالت کا ایسا زبردست ادارہ بن گئی۔ جس کوششوں سے اردو کو ریاست بہار میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ مل کر رہا۔ کنجوسی کی حد تک ایماندار ہیں"۔۔۔۔۔ ڈاکٹر اختر اورینوی مرحوم کے بعد ایسی چومکھی اور فعال شخصیت ریاست بہار میں فی الحال دوسری نہیں ہے"۔(9)

پروفیسر عبدالمغنی کی شخصیت کو اگر ہمہ جہت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ وسیع ذہن اور بالیدہ فکر ونظر کے مالک تھے اور وسیع المشرب بھی۔ ان میں کٹر پسندی نہ تھی وہ کسی مسلک کے تئیں شدت پسند بھی نہ تھے۔ ان کے تعلقات تمام شعبہ ہائے زندگی کے مختلف النوع افراد سے تھے اور سبھی ان کی شخصیت کا احترام کرتے اور ان کی عزت کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ سنجیدگی کا لبادہ نہیں اوڑھے رہتے تھے بلکہ اکثر موقعوں پر وہ بہت سنجیدہ مزاح سے اپنی باتوں اور جملوں کو بہت دلچسپ بنا دیا کرتے تھے۔ بلکہ گفتگو میں اکثر مزاح کے عناصر شامل ہوتے تھے۔ گورنمٹ اردو لائبریری کے لائبریرین جناب حسن احمد کہتے ہیں کہ وہ عام طور پر اسلامیات کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ معین الدین احمد ندوی کی کتاب تاریخ اسلام بھی اکثر پڑھا کرتے تھے۔ ساتھ ہی تفریحی کتابیں بھی زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ جیسے ابن صفی کے ناول اور نسیم حجازی کی تاریخی ناولیں۔ تیرتھ رام فیروز پوری کی کتابیں اور مظہر الحق علوی کی کتابیں جو انگلش کا ترجمہ ہوتی وہ بھی شوق سے پڑھتے۔ ادبی کتابوں کو پڑھ جاتے لیکن اس ادیب کے فن پر لکھی ہوئی دوسرے ناقد کی کتابیں نہیں پڑھتے۔ وہ عام طور پر احتشام حسین اور کلیم الدین احمد کی کتابیں زیادہ پڑھا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ

ایسے ادیبوں کو بھی پڑھتے جو کسی بھی تحریک یا اسکول سے منسلک ہوتے یا نہ ہوتے انھیں کسی ادب کو پڑھنے میں کوئی عار نہیں تھا بلکہ وہ کسی تحریک یا ازم سے منسلک نہ تھے اور نہ ہی کسی کے تئیں تعصب رکھتے تھے۔

اپنے مقالے کی تیاری کا ان کا اپنا خاص انداز تھا۔ وہ کاغذ لے کر بیٹھ جاتے اور خود لکھنا شروع کرتے وہ عام طور پر بہت چھوٹے چھوٹے حروف لکھتے اور قلم برداشتہ لکھتے جاتے۔ کہیں بھی رکاوٹ نہیں آتی اور نہ اپنے جملے کا کاٹ چھانٹ کرتے، اور ایک ہی نشست میں مقالہ مکمل کر لیتے تھے۔

ان کے یہاں بے شمار ادیبوں کی کتابیں آتی رہتی تھیں تا کہ ان پر ان کی رائے لی جاسکیں۔ جن میں سے اکثر کتابوں کو وہ صرف کھول کر دیکھتے اور چھوڑ دیتے۔ اگر کسی کے بارے میں لکھنا ہوتا تو جستہ جستہ پڑھتے یا کسی کو پڑھنے کے لیے دے دیتے اور اس کی رائے سن کر اپنا فیصلہ لکھ دیتے۔

ان کے قریبی لوگوں سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ ان کا رویہ محتاط ضرور رہتا تھا مگر وہ کسی کی دل شکنی سے پرہیز کرتے تھے۔ سیاسی لوگوں سے بھی ان کے تعلقات تھے مگر کبھی کسی کی چاپلوسی نہیں کی ان سے تعلقات رکھنے والوں میں اندارا گاندھی، فخر الدین علی احمد، جگن ناتھ مشرا، اخلاق الرحمٰن قدوائی، امام الحی خان، یشونت سنہا وغیرہ اہم ہیں۔

ادبی حلقے کو لوگوں سے ان کے تعلقات کا کیا کہنا تھا بے شمار ادیب وفن کاران کے جاننے والوں چاہنے والوں اور دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔ جیسے گوپی چند نارنگ، ظہیر احمد صدیقی، عبدالقوی دسنوی، خلیق انجم، ابن فرید، ابوذر عثمانی، احمد سجاد وغیرہ۔

ان کے خاص احباب میں مقامی ادیب وفن کار کی بھی ایک لمبی فہرست تیار ہوسکتی ہے۔ مگر چند کے اسمائے گرامی درج کیے جاتے ہیں۔ جیسے:

''محی الدین مرشد، لاکالج، انیس الرحمان آرٹ پریس، قیوم خضر، مدیر اشارہ، قیوم قائد اورینٹل کالج، ڈاکٹر انیس الرحمٰن عرف نمو، رضا نقوی واہی، سہیل عظیم آبادی، پروفیسر محمد محسن، سید بہاؤالدین احمد، ڈاکٹر کلیم عاجز، پروفیسر معز منظر، پروفیسر سید حسن، ڈاکٹر اختر قادری، پرفیسر عطا کوکوی، پروفیسر پی این شرما، پروفیسر ممتاز احمد، پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر سبکتگین، سائنس کالج،

ڈاکٹر احمد عبدالحی ،قمر اعظم ہاشمی ،شبیر احمد، ریاض عظیم آبادی، ڈاکٹر اعجاز علی ارشد،
رضی حیدر، ہارون رشید وغیرہ‘‘ ۔(10)

پروفیسر عبدالمغنی عام طور پر سیمینار کی دعوت قبول نہیں کرتے تھے۔ بہت سوچ سمجھ کر ہی ہاں کہتے اور اس کا بہت اہتمام کے ساتھ تیاری کرتے۔ وقت مقررہ پر سیمینار میں پہنچ کر اپنا مقالہ پڑھتے اور فوراً وہاں سے اجازت لے کر رخصت ہو جاتے۔ شاید یہ ان کی کمزوری تھی یا خود اعتمادی کی وہ اپنا مقالہ پڑھنے کے بعد ایک لمحہ بھی سیمینار میں نہیں رکتے تھے۔

پروفیسر عبدالمغنی کی زندگی ایک شریف ایماندار اور محنتی شخص کی زندگی ہے وہ کبھی بھی کسی معاملے میں متنازعہ فیہ نہیں رہے۔ ہو ہمیشہ بے لاگ اور کھری باتیں کرنے والے انسان تھے۔ وہ ان کے دل میں ہوتا وہی ان کے زبان پر بھی ہوتا تھا، اور شاید اسی لیے وہ کسی سے نہ مرعوب ہوئے اور نہ کسی کو مرعوب کرنے کی کوشش کی بلکہ لوگ ان کے اوصاف حمیدہ کے ہمیشہ رطب اللسان رہے ہیں ان کی زندگی ایک کامیاب انسان اور مخلص انسان کی زندگی تھی۔ وہ سماجی شعور رکھتے تھے۔ زندگی میں ہمیشہ اصول پسندی کو سراہتے رہے۔ وہ ایک بہترین ادیب و ناقد اور مفکر تھے۔ چند فتنہ پسند افراد کو ان سے شکایت بھی رہی کیوں کہ وہ کسی تحریک یا ازم کے حامی نہیں تھے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے پروفیسر عبدالمغنی کی وفات کے بعد خراج تحسین پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

’’ہندوستان مین جن لوگوں نے اردو کی بقا و ترقی اور فروغ کے لیے اپنا سب
کچھ قربان کر دیا تھا ان میں عبدالمغنی صاحب کا نام سرفہرست تھا‘‘ ۔(11)

ڈاکٹر محمود شیخ لکھتے ہیں:

’’پروفیسر عبدالمغنی بیک وقت ایک دانشور، محقق اور ناقد کے علاوہ تاریخ داں،
عالم دین، حافظ قرآن، ماہر تعلیم اور رفامر کی حیثیت سے اپنے ہم عصروں میں ممتاز
نظر آتے ہیں اور اردو زبان کے محافظ اور مبلغ کے طور پر یاد کیا جائے گا‘‘ ۔(12)

ادبی خدمات:

پروفیسر عبدالمغنی، پروفیسر کلیم الدین احمد کے بعد دوسرے دانشور ہیں جنھوں نے اپنا کیریر انگریزی ادب سے شروع کیا۔ انگریزی ادب میں اعلیٰ تعلیم حاصل کیا اور ملازمت یعنی درس و تدریسی زندگی بھی انگریزی ادب

سے متعلق رہالیکن اپنی مادری زبان اردو سے والہانہ عشق کی وجہ سے اردوادب کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد حیات بنالیا اور اردوادب، تنقید میں بیش بہا کتب اور متعدد مقالے لکھے۔انھوں نے اردوادب کو انگریزی ادب کے حوالے سے بھی پر کھا چوں کہ وہ خود انگریزی کی اعلیٰ تعلیم یافتہ استاد تھے، انھوں نے اردو تنقید میں ایک نئی روایت کی بنیاد ڈالی۔

اردو تنقید میں نا قابل فراموش خدامت انجام دیں۔کالج کے دنوں میں جب بزم ادب کے سکریٹری کا چناؤ الیکشن کے ذریعے ہوتا تھا وہ اس میں حصہ لیا کرتا تھا۔

پروفیسر عبدالمغنی کے ادب سے لگاؤ کے متعلق رقم پروفیسر احمد سجاد طراز ہیں:

> ''1955 میں پٹنہ کالج بی۔اے اردو آنرز کلاس میں خاکسار کا داخلہ ہوا۔ ان دنوں داخلہ ختم ہوتے ہی کالج کے مختلف طلبا تنظیموں بشمول بزم ادب پٹنہ کالج کے انتخابات کی گہما گہمی شروع ہوجاتی تھی۔۔۔معلوم ہوا کہ بی۔این انگریزی آنرز کے طالب علم اور بزم ادب کے عہدہ سکریٹری کے امیدوار ہیں۔ ہمارے ساتھی نے بتایا کہ یہ عبدالغنی ہیں۔جو مدرسہ شمس الہدیٰ کے عالم اور اردوزبان و ادب سے عشق کی حدتک تعلق رکھتے ہیں۔۔۔ایم۔اے کرتے کرتے علمی وادبی کے ساتھ ساتھ سیاسی و سماجی اور صحافی ولسانی مسائل پر بھی بے تکان اردو اور انگریزی میں لکھنا شروع کیا''۔(13)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ پروفیسر عبدالمغنی کی ادب سے کیا لگاؤ تھا اور وہ کس عمر سے ادب کو فروغ دینے کی طرف مصروف تھے۔

پروفیسر عبدالمغنی کا سب سے بڑا کارنامہ اردو کے لیے تحریک چلانا اور پورے بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے منوالینا ہے۔

پروفیسر عبدالمغنی کی ایک بہت خاص خوبی خطابت کی تھی۔وہ کسی مسئلہ پر جب غور وفکر کے بعد اپنا ایک خاص نتیجہ واضح کر لیتے تھے تو اس کی تائید میں ان کے موقف کو دلائل و براہین سے اس قدر آراستہ کرتے اور اتنی معلومات و وضاحت مخالف تک پہونچاتے کہ ان کے موقف سے انکار ہی نہیں کرسکتا تھا۔ادبی مجالس میں اپنی باتوں اور نظریہ کو

پیش کرنے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتے اور بے باک و بے لاگ ہوکر اپنا نظریہ اور اپنی رائے پیش کرتے۔ وہ اہل مجالس میں بااثر افراد کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتے۔ وہ اپنے حق کے لیے کبھی نہیں گڑگڑاتے بلکہ بے دھڑک ایوانوں میں بھی اپنی بات سلیقے سے رکھتے۔ جس زمانے میں اردو تحریک کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ انھوں نے ہی 1997 میں آل بہار اردو کانفرنس زیر اہتمام انجمن ترقی اردو بہار میں وزیر اعلی بہار مہمان خصوصی کی حیثیت سے موجود تھے۔ انھیں صاف صاف جتا دیا کہ وزیر اعلیٰ بہار اگر اردو کو اس کا دستوری حق دوسرے سرکاری زبان منظور کرتے ہیں تو بے شک وہ ہمارے سیاسی حلیف ہیں لیکن اگر نا منظور کرتے ہیں تو وہ ہمارے حریف ہیں اور اسی کانفرنس میں وزیر اعلی جگن ناتھ مشرا کو برملا اعلان کرنا پڑتا ہے کہ ہم اس جائز مطالبے کو منظور کرتے ہیں۔ چناں چہ اگلے اسمبلی سیشن 1980 میں اسے قانونی حق کے طور پر دو قسطوں میں پہلے ابتدائی پندرہ اضلاع اور دوسری قسط میں باقی ماندہ اضلاع (بشمول اضلاع جھارکھنڈ کہ اس وقت تک ریاست تشکیل نہیں ہوئی تھی) میں اصولی طور پر حاصل ہوگیا جس کے نتیجے میں آج ملک بھر کی سات یا آٹھ ریاست میں اردو کا قانونی حق تسلیم کیا جا چکا ہے۔

پٹنہ میں اردو بھون کی تعمیر بھی پروفیسر عبدالمغنی کی کوششوں اور اردو دوستی کا نتیجہ ہے، انھوں نے وزیر اعلیٰ سے نہایت ہی باوقار بلکہ بارعب انداز میں اردو بھون کی تعمیر کا مطالبہ رکھا اور بالآخر حکومت نے اسے تسلیم بھی کیا اور اس کا قیام عمل میں لایا۔

پروفیسر عبدالمغنی انجمن ترقی اردو بہار کے چھ بار صدر رہ چکے ہیں، انجمن ترقی ہند کے فعال سرگرم رکن تھے۔ پہلی دفعہ 1974-75 میں انجمن ترقی اردو بہار کے صدر منتخب ہوئے۔ اسی سال 1975 میں پورے ملک کی اردو اکیڈمی کی کانفرنس لکھنو میں جناب آنند نرائن ملا کے زیر صدارت منعقد ہوئی۔ جس کے عام اجلاس میں گورنر چنا ریڈی اور وزیر اعلیٰ نرائن دت تیواری کے علاوہ صدر جمہوریہ فخر الدین علی احمد بھی شریک ہوئے، پروفیسر عبدالمغنی بہار اردو اکیڈمی کے سکریٹری جناب سہیل عظیم آبادی کی رفاقت میں لکھنو پہونچے، انھیں بہار اکیڈمی کے وفد کا ترجمان بنایا گیا۔ ہر اکیڈمی کو اپنی اپنی باتیں رکھنے کے لیے پانچ منٹ کا وقفہ دیا گیا اسی مختصر وقت میں انھوں نے اردو کے تعلق سے پورے مسئلہ اور اس کا حل پیش کر دیا جس میں انھوں نے لسانی و تہذیبی پہلوؤں کے علاوہ معاشی، پہلوؤں کی اہمیت کو بڑی سنجیدگی سے سامنے رکھا۔ پوری اجلاس نے اور کانفرنس کے صدر وزیر اعلی گورنر اور صدر

جمہوریہ نے ان کے موقف کی پوری تائید کی۔ دوسرے ہی دن ''قومی آواز'' روزنامے نے جلسے کی روداد ''بہار کے نمائندے کے دل سے جو آہ نکلی وہ پوری محفل کا موضوع سخن بن گیا'' کے سرخی سے شائع کیا۔

1968 میں انھوں نے انجمن ترقی اردو بہار کے ترجمان کی حیثیت سے ایک ماہنامہ ادبی رسالہ ''مریخ'' کے نام سے جاری کیا۔ اس کے ذریعے انھوں نے اپنے نظریہ ادب وتنقید کوادبی دنیا کے سامنے رکھا۔ اس زمانے کی ادبی رجحان کی اشاعت اور غلط رجحان کی تصحیح بھی کی جسے جدیدیت کی تحریک کے ذریعے آزاد نظم، آزادغزل، نثری نظم، پلاٹ لیس افسانے جسے بے ماجرا تجریدی افسانے کہتے ہیں جیسی اصناف کو بالکل رد کیا۔ ان کا خیال تھا کہ ادب اگر قاری کی سمجھ سے باہر ہے تو وہ ادب نہیں اگر وہ ابلاغ وترسیل کا کام نہیں کر رہا ہے تو اسے ادب نہیں کہا جا سکتا ہے، نتیجے کے طور پر بے ماجرا تجریدی افسانوں پر روک سی لگ گئی اور آزاد نظم لکھنے والے پابند نظم نگاری کی طرف رجوع کرنے لگے۔ اس موقف نے ادب اور قارئین کے درمیان ٹوٹتے ہوئے رشتے کو جوڑنے کا کام کیا۔ ادب کی کم یا گم ہوتی ہوئی مقبولیت پر روک لگ گیا۔ جس قدر ادب کی خدمت اس رسالے سے ہوئی وہ قابل ستائش تو ہے ہی بلکہ اردو ادب کی تاریخ میں اسے ایک یادگار کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ رسالہ تحقیق کرنے والوں کے لیے دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

پروفیسر عبد المغنی زمانہ طالب علمی سے ہی اردو زبان و ادب کے تعلق سے ملک و بیرون ملک کے معتبر رسالوں کے لیے مضامین لکھتے رہے۔ ان کے اندر تنقیدی شعور کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا وہ کسی خاص نظریہ تنقید کی پیروی نہیں کرتے بلکہ ان کے یہاں تنقید ادب میں ایک اعتدال نظر آتا ہے۔ انھوں نے بڑے صاف لفظوں میں ادب کو سماج کا آئینہ کہا۔ ان کے نزدیک جس سماج کا ادب بے راہ روی اور نقائص کا شکار ہو جاتا ہے اس کے دل و دماغ بھی اپنی جگہ صحیح اور معتدل نہیں رہتے۔ جس سماج اور معاشرہ کا ادب مریضانہ ہوگا اس کے افراد بھی مریض ہوں گے انھیں کسی طور سے صحت مند نہیں کہا جا سکتا۔

انھوں نے اشتراکیت کے دور میں جم کر اس کی مخالفت کی۔ انھیں خدشہ تھا کہ یہ تحریک اخلاق، اقدار اور مذہبی روایات سے اختلافات میں ہماری بنیاد کو نقصان پہنچائے گی۔ وہ کسی نئی سوچ اور زاویہ ادب کے مخالف نہیں لیکن ادب میں شدت پسندی اور انتہا پسندی کے سخت مخالف تھے۔ پروفیسر عبد المغنی کا پہلا تنقیدی مضامین کا

مجموعہ ''نقطہ نظر'' کے نام سے 1965 میں منظر عام پر آیا جب کہ مضامین 1950-59 سے مختلف رسائل میں شائع ہو رہے تھے، پروفیسر عبدالمغنی نقطہ نظر میں اپنی ادبی تنقیدی نظریہ کو پیش کرتے ہیں:

''میری ادبی تنقیدوں کا بھی ایک نقطہ نظر ہے۔ میرے خیال میں انسان کی زندگی کسی حیوانی ارتقا کا نمونہ نہیں یہ ایک الوہی تخلیق کا ہی نتیجہ ہے چناں چہ آدمی طبقاً ایک ذمہ دار اور شریف مخلوق ہے۔ انسانی سماج کی ترقی جنسی یا معاشی کش مکش کی مرہون منت نہیں یہ ترقی سراسر اخلاقی تعاون کا عطیہ ہے۔۔۔ میں ہر مقالے میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ فن اپنے جمالیاتی وسائل سے کس طرح زندگی کی شرافت کو اجاگر کرتا ہے''۔(14)

پروفیسر عبدالمغنی اپنی کتاب ''جادہ اعتدال میں رقم طراز ہیں:

''میرا تصور تنقید یہ ہے کہ زندگی اور ادب دونوں اپنی اپنی جگہ ایک کل اور ایک دوسرے کے ساتھ مربوط سمجھ کر پارہ فن کا تجزیہ و تبصرہ اس انداز سے کرنا چاہیے کہ فن کے تمام حاضر ولوازم کی پوری تصویر ابھرے اور ساتھ ہی ادب و زندگی کی اصلیت و عظمت کی قدریں نکھریں اور سنوریں''۔(15)

ادب وتنقید سے لگاؤ اور تنقید کی طرف قلم اٹھانے کے متعلق خود پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

''ادب میرا پہلا عشق دیا ہے اور اس کو تزئین حیات کا بہت بڑا وسیلہ سمجھتا ہوں، اور میرا خیال ہے کہ جس معاشرے کا ادب خراب ہو جاتا ہے اس کے دل و دماغ بھی سلامت نہیں رہتے۔۔۔ جس قوم کی شاعری، افسانہ، ڈرامہ، ناول اور تنقید منصفانہ ہوں اس قوم کو کسی بھی طور صحت مند نہیں سمجھا جا سکتا ہے ان ہی خیالات نے 1952 میں تنقید ادب کی طرف مائل کر دیا''۔(16)

پروفیسر عبدالمغنی کے کل تنقیدی مضامین کا گیارہ مجموعہ شائع ہو کر مقبول عام ہو چکا ہے درج ذیل ہیں:

(1)''نقطۂ نظر 1965''،(2)''جادۂ اعتدال 1972''،(3)''تشکیل جدید 1976''،(4)''معیار و اقتدار 1981'' (5)''تنقید مشرق 1987''،(6)''تصورات 1988''(7)''اسلوب تنقید 1989''،(8)''تنقیدی زاویئے 1993''(9)''فروغ تنقید 1998''(10)''تنویر

اقبال1990 ''(11)''اندازِ تنقید2007 ''وغیرہ۔

اقبال صدی کے موقع پر رسالہ ''نقوش'' میں پروفیسر عبدالمغنی خود رقم طراز ہیں:

''اقبال صدی سے قبل ''نقوش'' میں میرا مقالہ ''اقبالؔ کا فن'' شایع ہوا۔ ایک روز میں ڈاکٹر اختر اورینوی سے ملنے حسب معمولی اس کے شعبے میں گیا تو جناب جمیلؔ مظہری وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھے دیکھتے ہی جوش میں کھڑے ہوکر کہا: ''آپ نے فن میں بھی اقبالؔ و غالبؔ'' کے عنوان سے جلد ہی ایک مبسوط مقالہ تحریر کردیا جو ''معارف'' میں بہ اقساط شایع ہوا اور میرے پہلے مجموعے ''نقطہ نظر'' میں شامل ہے۔ اس کے بعد جناب جمیلؔ مظہری بالکل خاموش رہے''۔(17)

انجمن کے حلقۂ ادب نے متعدد مشاہیر کے متعلق سیمینار منعقد کیے اور اس موقع پر پیش کیے گئے مقالات ماہنامہ ''آج کل'' نئی دہلی وغیرہ رسائل کے خاص نمبروں میں شایع کرائے۔ مختلف علمی، ادبی، لسانی اور تہذیبی موضوعات پر بڑے بڑے جلسے حلقے کے زیر اہتمام سال ہا سال سے ہوتے رہے ہیں۔ انجمن نے ایک مدت تک ہزاروں غیر اردو دانوں کو آسان اور مختصر طریقے سے بہت کم وقت میں اردو سکھانے کا انتظام بھی کیا اور اس طرح اردو تعلیم یافتہ افراد کو باضابطہ اجلاس منعقد کر کے اسناد تقسیم کیں۔ اسی طرح اقلیتی تعلیمی اداروں کے مسائل کے حل کے لیے ایک نمائندہ بورڈ بھی قائم کیا۔ انجمن کے نمائندے ریاست کی ہر یونی ورسٹی کی سینٹ میں ممبر ہیں اور سینٹ سے منتخب ہو کر سنڈیکیٹ میں بھی آتے رہے ہیں جہاں وہ اردو کی اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں موثر اقدامات کرتے ہیں۔ 1969 فراقؔ گورکھپوری کی شاعری پر پروفیسر عبدالمغنی کا مقالہ ''نقوش'' میں جناب طفیل نے ایک ادارتی نوٹ کے ساتھ شایع کیا کہ یہ مقالہ ان کے جسے فراقؔ جڑوں کو کھولے گا، لہذا اگر کوئی صاحب اس کا جواب دیں تو وہ بھی شایع کیا جائے گا لیکن کسی نے اس مقالے کا جواب نہیں دیا، جناب آنند نرائن ملا نے پٹنہ کے ایک مشہور روزنامہ کے مدیر کو ایک ذاتی خط میں لکھا کہ کسی کے لیے کوئی جواب ممکن نہیں ہے اس لیے کہ فراقؔ کی شاعری کا مذکور مکالمہ بالکل دوست ہے۔

پروفیسر عبدالمغنی نے حلقۂ ادب کے زیر اہتمام متعدد مشاہیر کے تعلق سے سیمینار منعقد کرائے، ان

سیمیناروں میں پڑھے گئے مقالات کو ماہنامہ ''آج کل''نئی دہلی کے خاص نمبروں میں شایع کرا کر نئے تحقیق کرنے والوں کے لیے دستاویزی شواہد فراہم کیے۔ انجمن حلقہ ادب کے بینر تلے انھوں نے مختلف علمی، ادبی، لسانی اور تہذیبی موضوعات پر بڑے بڑے جلسے کا اہتمام کروائے۔ انجمن کے ذریعے ایک طویل مدت تک ہزاروں غیر اردو دانوں کو آسان اور مختصر طریقے سے بہت کم وقت میں اردو سکھانے کا انتظام بھی کیا اور اس طرح اردو تعلیم یافتہ افراد کو باضابطہ اجلاس کرا کر اسناد تقسیم کیں، جس سے اردو زبان وادب کے فروغ میں نمایاں نسخہ ثابت ہوئیں۔

پروفیسر عبدالمغنی کے کئی تنقیدی مضامین کے مجموعوں کے علاوہ سب سے اہم اور شاہکار تصنیف ''اقبال اور عالمی ادب 1982'' ہے۔ انھوں نے اقبال شناسی کے نئے زاویے و نقطہ نظر کا انکشاف کیا۔ اقبال کا نظام فن، اقبال کا نظریۂ خودی، اقبال کا ذہنی وفنی ارتقا، تہذیبوں کا تقابلی مطالعہ، فکر اقبال کی روشنی میں تصانیف اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی کو اسلام پسندی پر فخر ہے اور یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ ذہنی فکری اعتبار سے وہ اقبال کے بہت قریب ہیں۔

اقبال اور عالمی ادب، کلیم الدین احمد کی کتاب ''اقبال ایک مطالعہ'' کا جواب ہے۔ اس کتاب میں پروفیسر عبدالمغنی نے نہ صرف یہ کہ کلیم الدین احمد کے اردو تنقیدی کارناموں کا بھرپور جائزہ لیا ہے بلکہ خاص طور پر ''اقبال ایک مطالعہ'' میں اقبال کا جو ناقص مطالعہ اور فریب کارانہ انداز نظر اختیار کیا ہے اس کا تحلیل وتجزیہ کر کے ادبی دنیا کے سامنے نمایاں کیا ہے۔ وہیں انگریزی کے استاد ہونے کی وجہ سے یہ کتاب عالمی ادب خصوصاً انگریزی ادب کا بھرپور جائزہ اور اس کے مقابلے میں اقبال کے مرتبہ ومقام پہ ایک مستقل بحث ہے جو بیک وقت ادب کے عالمی تصورات اور کلام اقبال کے فن وفکری مضمرات کا احاطہ کرتی ہے۔

پروفیسر عبدالمغنی کی کتاب ''اقبال اور عالمی ادب'' اور کلیم الدین احمد کی کتاب ''اقبال ایک مطالعہ'' دونوں کو کریسینٹ پبلیکیشنز گیا نے ہی پہلی بار شایع کیا۔ اقبال اور عالمی ادب کے سلسلے میں ناشر ''عرض ناشر'' کے تحت لکھتے ہیں:

> ''اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پہلی بار مغربی
> ادب اور اس کے تصورات سے مرعوب ہوئے بغیر نہایت وقار کے ساتھ پورے

عالمی ادب کے بنیادی تصورات کا ایک زبردست تنقیدی جائزہ لے کران کے پس منظر میں اصولی وفنی طور پر اقبال کے اعلیٰ مقام کی نشان دہی کی گئی ہے۔اس طرح یہ تصنیف نہ صرف اقبالیات بلکہ عالمی ادبیات کے تنقیدی مطالعہ کا ایک بالکل نیا،منفرد اور امتیازی انداز پیش کرتی ہے''۔(18)

اقبال اور عالمی ادب میں پروفیسر عبدالمغنی نے دو عنوانات ''اقبال کی طویل اردو نظمیں اور اقبال کی مختصر اردو نظمیں'' کے تحت ان تیرہ نظموں کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔جس طرح انھوں نے ان تیرہ نظموں کا تحلیل و تجزیہ کر کے اقبال کی ان نظموں کا انگریزی شعرا سے محاکمہ وموازنہ کیا ہے وہ دنیائے شعروادب میں اقبال کی شاعرانہ عظمت کا یقین دلاتی ہے۔اسے اردو ادب و تنقید میں ایک شاہکار اور اقبالیات کے تعلق سے ناقابل فراموش تصنیف قرار دیا جا تا ہے۔

پروفیسر عبدالمغنی کا نظریہ ادب وتنقید:

ایک تنقید نگار کی حیثیت سے پروفیسر عبدالمغنی کی ایک الگ پہچان ابھر کر آتی ہے۔کلیم الدین احمد، احتشام حسین، آل احمد سرور اور گوپی چند نارنگ جیسے ہم عصر ناقدین کے درمیان انھوں نے نا صرف الگ پہچان بنائی ہے بلکہ ان کے نظریات سے اختلاف کرتے ہوئے اردو تنقید کو ایک نئے نقطہ نظر سے اور معیار واقدار سے روشناس کرایا ہے۔رومانی تنقید، نفسیاتی تنقید، تاثراتی تنقید، ترقی پسند تنقید، جدید تنقید اور مابعد جدید نیز ساختیاتی تنقید انتہا پسندوں کے برخلاف انھوں نے ایک جادۂ اعتدال اختیار کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور آج جب اردو تنقید میں ہر تنقید نگار اپنے آپ کو ایک دبستان تنقید ثابت کرنے میں لگا ہوا ہے۔ہمیں اس بات کا شدید احساس ہوتا ہے کہ تنقید کے لیے ایک واقعی جادۂ اعتدال کی ضرورت ہے حالاں کہ پروفیسر عبدالمغنی کی تنقید کے مطالعے کے دوران اس بات کا بھی احساس ہوتا ہے کہ وہ خود بعض جگہوں پر جادۂ اعتدال سے ہٹ کر اپنی بات منوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔اقبالیات کے تعلق سے کلیم الدین احمد اور عبدالمغنی دونوں کے یہاں اس چیز کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

اس کے باوجود اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی باتیں آئینہ کی طرح شفاف ہیں اور وہ تنقید میں شفافیت کے قائل ہیں۔مجموعی طور پر ہم عبدالمغنی کو مشرقی نقاد اور تہذیبی و اخلاقی قدروں کے پاسدار ادب میں

کلاسیکیت کے قائل ہیں۔

عبدالمغنی اپنے تنقیدی نظریات میں اخلاقی قدروں پر زور دینے کے ساتھ ساتھ اپنے ادبی رجحانات کو مذہبی رجحانات سے ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ جس طرح ٹی۔ایس۔ایلیٹ نے اپنی آخری عمر میں اپنے تنقیدی نظریات کو عیسائیت سے جوڑ دیا ہے ٹھیک اسی طرح اسلامی نظریات کا اردو ادب پر نقش ہونا ضروری ہے۔

ادب وتنقید کے تعلق سے پروفیسر عبدالمغنی کے چند نظریات پیش کیے جارہے ہیں۔

نظریۂ ادب:

(1) ادب فنون لطیفہ کی اعلیٰ ترین شکل ہے۔انسانی خیالات کی تہذیب وترتیب میں اس کا رول عظیم ترین ہے۔ادب کے بغیر مہذب انسانیت کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ثقافت کی تمام قدروں کی پرورش،اظہار اور ارتقا کا کام ادب ہی اپنی مختلف اسالیب واصناف کے ذریعے کرتا ہے۔۔۔اس حقیقیت کے پیش نظر ادب کی سنجیدگی اور ذمہ داری اس کی بنیادی لوازم اور خصائص قرار پاتے ہیں۔

(2) ادب کی ہیئت دوعناصر سے مرکب ہوتی ہے۔ایک فکر،دوسرا فن.......لہذا ادب کی زندگی اور ترقی کے لیے ناگزیر ہے کہ فکر اور فن کے درمیان کامل اعتدال اور توازن ہو۔اس میں ایک طرف فکر کی استقامت ہوتو دوسری طرف فن کی جمالیات دونوں ایک دوسرے کے بالکل برابر، بلکہ ایک دوسرے میں اس درجہ پیوست کہ من وتو کا کوئی فرق باقی نہ رہے،اور یہ ادبی کل اپنے قاری کو بیک وقت مسرت اور بصیرت نشاط اور دانش،آرزو اور کاوش کا سامان فراہم کرے۔

(3) ادب کے نام پر پیش کی جانے والی ہر وہ چیز غلط ہے جو ثقافت،تہذیب اور زندگی کے اقدار اور اصول و آداب سے ٹکرانے والی اوران کے تردید وتخریب کرنے والی ہو، چناں چہ ادب میں جمالیات کا کوئی تخیل اخلاقیات سے بے گانہ نہیں ہوسکتا، بلکہ اخلاقیات سے بے نیاز ہوکر جمالیات کا کوئی مطلب ہی نہیں رہ جاتا ہے۔فحاشی اور بدکاری کو کتنی ہی خوب صورت پردوں میں پیش کیا جائے ان کی کراہت اور قباحت کو گوارہ نہیں بنایا جاسکتا۔خوش نمائی بغیر کسی خوبی کے فریب محض ہے اس سے تسکین ومسرت کا احساس کسی صحت مند ذہن کو نہیں ہوسکتا۔

نظریہ تنقید:

(1) میرا تصور تنقید یہ ہے کہ زندگی اور ادب دونوں کو اپنی اپنی جگہ ایک کل، اور ایک دوسرے کے ساتھ مربوط سمجھ کر پارۂ فن کا تجزیہ و تبصرہ اس انداز سے کرنا چاہیے کہ فن کے تمام حاضر و لوازم کی پوری تصویر ابھرے، اور ساتھ ہی ادب اور زندگی کی اصلیت و عظمت کی قدریں نکھریں و سنوریں۔

(2) اس وقت اردو تنقید میں تجزیہ و تبصرہ کی نمایاں اسالیب مارکسی، نفسیاتی، جمالیاتی، تاثراتی اور متنی ہیں۔ میرے نزدیک یہ سبھی ناقص ہیں۔ پورے ادب اس کی حقیقت اور عظمت کو ان میں سے کوئی بھی واضح نہیں کر پاتا۔ یہ سب اپنی اپنی جگہ اہمیت ضرور رکھتے ہیں، مگر یہ ادھوری سچائیوں کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے پاس نہ ایک زندگی کا ایک کلی اور متوازن نظریہ ہے اور نہ ادب کا۔ وہ ادب اور زندگی کے صرف بعض پہلوؤں پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں اور اس میں انتہا پسندی سے کام لیتے ہیں، غلو اور مبالغہ کرتے ہیں۔ اس عدم اعتدال اور عدم توازن کے سبب ان اسالیب کے ذریعے کیا ہوا تمام تجزیہ و تبصرہ مجموعی طور پر ادبی فن پاروں کو غلط شکل میں پیش کرتا ہے۔ اور اس سے ادب کا ایک مغالطہ آمیز تصور ابھرتا ہے جس سے ذوق و شعور کی تربیت کم اور تخریب زیادہ ہوتی ہے۔

(3) حقیقت یہ ہے کہ میں تنقیدی نظریہ کا قائل ہوں، اور جب نظریہ کی جستجو کی جائے گی تو ظاہر ہے کہ کسی نظام فکر اور فلسفہ حیات کا تجسس کیا جائے گا۔ چناں چہ ہمارے سامنے جو نظریات ہیں وہ عمومی اور بنیادی طور پر دو ہی قسم کے ہیں، ایک روحانی و اخلاقی، دوسرا مادی و معاشی۔۔۔ مجھے یہ کہنے میں کچھ تامل نہیں کہ میں مادی و معاشی پر روحانی و اخلاقی کو ترجیح دیتا ہوں۔

(4) جب فکر و نظر میں جدیدیت کے لیے گنجائش ہے تو قدامت کے لیے کیوں نہیں؟ اقبال کی شاعری میں اسلام، ٹیگور کی شاعری میں دیانت اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی شاعری و تنقید میں مسیحیت، ان کی ادبی کاوشوں کے نتیجے اور نمونوں کے لیے کوئی عیب تو نہیں۔۔۔ اسی طرح میری تنقید میں اسلام میں ایک وصف تو ہو سکتا ہے، عیب نہیں، خواہ کوئی اس وصف سے کوئی اختلاف ہو یا اتفاق، کوئی اسے پسند کرے یا ناپسند، قبول کرے یا رد۔

(5) میں ایک ادیب اور شاعر کو سب سے پہلے ایک ادیب اور ایک شاعر ہی کی حیثیت سے لیتا ہوں، اور حتی الوسیع اس کے فن کا ایک معروضی تجزیہ کر کے اس کے عوامل و عناصر دریافت کرتا ہوں۔ اس فن کو ادب کے مجموعی

روایت کے پس منظر میں رکھ کراس کی نوعیت، حقیقت اوراہمیت پر بحث کرتا ہوں۔اس کے بعدزیرتبصرہ فن کے متعلق فیصلہ اپنے خاص تنقیدی موقف سے، معروف و مسلم انسانی واخلاقی قدروں کی روشنی میں کرتا ہوں، اوراس فیصلے کے مطابق ادب اورتہذیب کی تاریخ میں فن کا مقام معین کرتا ہوں۔

(6) نئی تنقید کو بھی اپنی قدریں اپنے کلاسکی ادب اوراس کی تہذیبی قدروں کو تلاش کرنے اوراس زبان میں گفتگو کرنی ہوگی جواردو معاشرے کی جانی پہچانی اور مانی ہوئی زبان ہے۔

تصانیف:

پروفیسرعبدالمغنی کی 1965 سے لےکراب تک تقریباً پچاس کتب مختلف عناوین سے متعلق منظرعام پرآ چکی ہیں۔وہ ہمہ جہت شخصیت کے حامل تھے، وہ بیک وقت صحافی، معتبر ناقد، عالم دین، حافظ، مورخ اورایک سنجیدہ خطیب بھی تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تنقیدی کتب کے علاوہ متفرق عنوانات پر دیگر کتابیں بھی لکھیں جوتاریخ، سوانح، مذہب اور سیاست سے متعلق ہیں۔انھوں نے علامہ ڈاکٹرمحمد اقبال کے افکارونظریات پر کئی مدلل کتابیں لکھیں ہیں۔مرزا غالب، برناڈ شاہ، ابوالکلام آزاد، مولانا مودودی، قرۃالعین حیدر، ٹیپو سلطان، محمود غزنوی، میرتقی میر، فیض احمد فیض وغیرہ جیسی اہم اور نامورشخصیات سے متعلق بھی موضوعی کتابیں ملتی ہیں۔ پروفیسرعبدالمغنی کے مقالات اپنے آپ میں خصوصیت اوراہمیت کے حامل ہیں۔جس سے ان کی تنقیدی نظریہ، مقصد انتقاد، اسلوب انتقاد، مشرقی تنقید، فروغ تنقید، کا اندازہ ہو جاتا ہے، اورتنقید میں ان کے اقدار و معیار کا پتہ چلتا ہے۔ذیل میں پروفیسرعبدالمغنی کی تصانیف درج ہے سن اشاعت کے مطابق ترتیب وار:

نمبرشمار	کتاب کا نام	سنہ اشاعت
1	نقطۂ نظر (مجموعۂ مضامین)	1965
2	جادۂ اعتدال (مجموعۂ مضامین)	1972
3	ہندوستان میں مسلم اقلیت کا مسئلہ	1972
4	برناڈ شاہ	1976

1976	تشکیل جدید (مجموعۂ مضامین)	5
1981	معیار و اقدار (مجموعۂ مضامین)	6
1982	اقبال اور عالمی ادب	7
1985	اقبال کا نظام فن	8
1986	T.S. Eliot's Concept of cultur	9
1987	تنقید مشرق (مجموعۂ مضامین)	10
1987	طرز تعلیم	11
1987	قرآن کا تصور جنس	12
1988	تصورات (مجموعۂ مضامین)	13
1988	مابعد صنعتی معاشرہ اور اسلام	14
1989	مولانا ابوالکلام آزاد ذہن و کردار	15
1989	دہشت پسندی اور اسلام	16
1989	مولانا مودودی کی ادبی خدمات	17
1989	قرآن مجید کا ادبی اعجاز	18
1989	اسلوب تنقید (مجموعۂ مضامین)	19
1989	اسلامک سول کوڈ (Islamic civil court)	20
1990	تنویر اقبال (مجموعۂ مضامین)	21
1990	عظمت غالب	22
1990	قرآن کا فلسفہ تاریخ	23
1990	اقبال کا نظریہ خودی	24
1991	مولانا ابوالکلام آزاد کا اسلوب نگارش	25

26	قرۃ العین حیدر کا فن	1991
27	اقبال کا ذہنی و فنی ارتقاء	1991
28	ٹیپو سلطان	1991
29	دا وے آف اسلام (The Way Of Islam)	1992
30	اقبال دا پوئٹ (Iqbal The Poet)	1992
31	اورنگ زیب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ	1992
32	قرآن کیوں پڑھیں	1992
33	قرآن کا نظریۂ کائنات	1993
34	محمود غزنوی	1993
35	تنقیدی زاویے (مجموعۂ مضامین)	1993
36	ہندستان کے لیے مستقبل کا نقشۂ عمل	1994
37	فروغ تنقید (مجموعۂ مضامین)	1998
38	غالبؔ کا فن	1999
39	میرؔ کا تغزل	2000
40	اسلام اینڈ ٹیراریزم (Islam And Terrorism)	2000
41	تہذیبوں کا تقابلی مطالعہ فکر اقبال کی روشنی میں	2001
42	فیض کی شاعری	2001
43	بہار میں اردو کا سرکاری استعمال	
44	ٹرانسلیشن آف دا قرآن (Translation Of The Quran)	
45	این اپروچ ٹو دا ورلڈ ہسٹری (An Approach to World History)	
46	اندازے تنقید (مجموعۂ مضامین)	2007

پروفیسرعبدالمغنی مشاہیر ومعاصرین کی نظر میں:

پروفیسرعبدالمغنی کی شخصیت اردو ادب میں مختلف الجہات کی حامل رہی ہے ادب کے مختلف گوشوں میں ایک مستحکم ستون کی حیثیت سے انھوں نے جو اپنی ایک معتبر شناخت بنائی ہے وہ اردو ادب ایک نا قابل فراموش حصہ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پروفیسرعبدالمغنی ایک نابغہ روزگار شخصیت کے مالک تھے جن کی حیات کا ہر ورق اپنے آپ میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے معاصرین، ناقدین اور ماہرین علم وادب کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے ان کی شخصیت اور فن کے تعلق سے مختلف موقعوں پر اپنی آرا کا اظہار کرتے ہوئے انھیں ایک عہد ساز شخصیت قرار دیا ہے۔

ہندوپاک کے بیشتر ارباب قلم اور دانش ورحضرات ہمیشہ ان کی علمی وادبی شخصیت کے معترف رہے ہیں ان پر لکھے گئے تعزیتی شذرات سے بھی ان کے قد اور شخصیت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اردو کے معروف ومعتبر نقاد وقومی کونسل کے سابق وائس چیئرمین شمس الرحمان فاروقی پروفیسرعبدالمغنی کے تعلق سے رقم طراز ہیں:

> ''پروفیسرعبدالمغنی کا نام اردو زبان وادب کی تاریخ میں کئی حیثیتوں سے یادگار رہے گا لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ بہار میں انجمن ترقی اردو انتہائی فعال ادارہ بنانا اور پھر اس کے ذریعے بہار کے ارباب سیاست کو مجبور کر کے بہار کی دوسری سرکاری زبان کی درجہ دلوانا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جدید ہندوستان میں اردو کے لیے جدوجہد میں بہار نے رہنما کردار ادا کیا ہے اور اس کا اعجاز بڑے حد تک پروفیسر عبدالمغنی کو جاتا ہے۔ اردو تنقید میں بھی انھوں نے ایک مخصوص ورش اپنائی تھی اور وہ تازندگی اس پر گامزن رہے ان کے انتقال سے اردو زبان وادب کو بڑا نقصان پہنچا جس کی تلافی فی الحال ممکن نہیں معلوم ہوتی''۔(19)

ڈاکٹرخلیق انجم نے بھی پروفیسرعبدالمغنی کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ہندوستان میں جن لوگوں نے اردو کی بقا اور ترقی اور فروغ کے لیے اپنا

سب کچھ قربان کر دیا تھا ان میں پروفیسر عبدالمغنی کا نام سرفہرست ہے''۔(20)

اردو کے نامور دانشور اور نقاد پروفیسر وہاب اشرفی اپنے مطبوعہ مضمون ''عبدالمغنی اردو تحریک کے ایک ستون اور منفرد نقاد'' میں پروفیسر عبدالمغنی کے تئیں تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بنیادی طور پر پروفیسر عبدالمغنی مشرقی افکار کے نقاد ہیں۔ انھوں نے کلیم الدین احمد کی ضد کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا لیکن کلیم الدین احمد کے یہاں تذلیلی انداز ہوتا ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی اپنی ذاتی رائے پر اعتبار کرتے ہیں جسے عام طور پر مدلل نہیں بناتے ان کی رائے ضمنی طول پکڑتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بعض اوقات ان پر القا ہو رہے ہیں۔۔۔ وہ مغرب کی اعلیٰ سے اعلیٰ مستند سے مستند فن پارے کو رد کرنے سے نہیں چوکتے کبھی کبھی کسی مغربی ادیب اور شاعر کو اپنے مطالعہ کی روشنی میں اس طرح سے پیش کرتے ہیں جیسے وہ اردو ادب کے دوسرے اور تیسرے درجے کا فن کار بھی نہیں ہے لیکن ان کی ایسی رائے زنی ان کے مشرقی مطالعات کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ عبدالمغنی اپنے طرز کے انوکھے اور منفرد نقاد ہیں جن کے سوچنے اور سمجھنے کا انداز سبھوں سے الگ ہے''(21)

غالب انسٹی ٹیوٹ کے سابق ڈائریکٹر اور اردو کے نقاد و ادیب شاہد ماہلی نے اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''پروفیسر عبدالمغنی سادگی خلوص ایمانداری اور شرافت کا ایسا مجسمہ تھے کہ جس کی مثال ملنی مشکل ہے جنھوں نے اپنی ساری زندگی زبان و ادب کی ترقی کے لیے صرف کی۔ بہار میں اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے جس شخص نے سب سے زیادہ کام کیا ان کا نام پروفیسر عبدالمغنی ہے''۔(22)

اردو کے جید عالم پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی نے ایک تعزیتی جلسے میں پروفیسر عبدالمغنی کے تئیں اپنے خیالات کا یوں اظہار کیا:

''پروفیسر عبدالمغنی ہندوستان میں اردو تحریک کے اہم رہنما تھے ان کی شخصیت کئی اعتبار سے نمایاں تھیں۔ انھوں نے ادب و تنقید اور ادبی صحافت میں

اہم رول ادا کیا۔ان کی تحریریں اور تصانیف علمی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔وہ تعلیمی تحریکوں میں بھی سرگرم رہے وہ نا صرف مدتوں بہار کی انجمن ترقی کے صدرر رہے بلکہ مرکزی انجمن ترقی اردو ہند کے مجلس عاملہ کے نہایت اہم رکن تھے۔۔۔ان کے انتقال سے جو خالی جگہ ہوئی ہے وہ کبھی پرنہیں ہو سکے گی''۔(23)

مکتبہ جامعہ لمیڈ یڈ کے ڈئریکٹر اورانجمن ترقی اردو ہند کے مجلس عاملہ کے رکن شاہد علی خاں نے اپنے تعزیتی تاثرات میں کہا:

''پروفیسرعبدالمغنی کی پوری زندگی درویشوں کے انداز کی تھی انھوں نے کبھی مادی اسائشوں کی پرواہ نہیں کی ہمیشہ فقیرانہ زندگی گزاری اسی رویے کی وجہ سے وہ ہندوستان کے ہر دل عزیز اور اردوتحریک کے فعال شخصیت تسلیم کیے جاتے تھے''۔(24)

پروفیسرعبدالمغنی کے متعلق پاکستانی دانشور پرفیسر رفیع الدین ہاشمی رقم طراز ہیں:

''وہ بہت بیباک جرأت منداور دبنگ شخص تھے اپنے نظریات اور مختلف مسائل میں بہت پختہ، واضح اور دوٹوک موقف رکھتے تھے۔بہار میں اردوتحریک کی جدو جہد اوراس کی کامیابی ان کی جرات مندانہ قیادت ہی کا نتیجہ تھی اردو زبان وادب کے محاذوں کے علاوہ سیاسی اورقومی مسائل پروہ کھل اظہار خیال کیا کرتے۔حق تو یہ ہے کہ ان کی زندگی آئینہ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی کی سچی تصویرتھی''۔(25)

سید احتشام حسین ایک خاص مضمون پرتبصرہ کرتے ہوئے پروفیسرعبدالمغنی کے اندازتنقید کے متعلق رقم طراز ہیں:

''اس مضمون کو پڑھ کر مجھے اس لیے تسکین ہوئی کہ اس کے لکھنے والے نے ہمدردانہ میرے خیالات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، اور جہاں اس کے ذہن و عقیدے نے اتفاق کی گنجائش نہیں پائی تو وہاں اختلاف کیا ہے۔تنقید کا یہ انداز

مخالفت سے ایک احسن المجادلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں لفاظی وطعن و پینترے بازی نہیں ہے اپنے علم اور مطالعہ سے مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے بلکہ منطقی انداز میں اعتراضات وارد کرکے بعض بعض مسئلوں کی وضاحت کا مطالبہ کیا گیا ہے لکھنے والے نے میری نیت پر شک نہیں کیا ہے میرے علم میں ناقص پایا ہے میرے عقیدے میں کوتاہی؟ ذہن پر محمول کیا ہے''۔(26)

عہدے اور اعزازات:

☆ ہیڈ آف انگلش ڈیپارٹمینٹ (بی۔این کالج) پٹنہ یونی ورسٹی رہے

☆ وائس چانسلر للت نارائن متھلا یونی ورسٹی دربھنگہ بہار کے عہدے سے سرفراز کیے گئے۔

☆ انجمن ترقی اردو بہار کے ریاستی صدر کے عہدے پر تاعمر فائز رہے۔1974 سے

☆ صدر حلقہ ادب، بہار 1964 سے

☆ رکن مجلس عاملہ اور مجلس عام انجمن ترقی اردو ہند، دہلی

☆ رکن بہار اردو اکیڈمی

☆ رکن جامعہ اردو علی گڑھ

☆ بہار ٹیکسٹ بک پبلیشنگ کارپوریشن کے ڈائریکٹر رہے

☆ رسالہ ماہنامہ ''مریخ'' کے ترجمان حلقہ ادب بہار کے تاحیات مدیر اعلیٰ رہے۔

☆ بہار اقلیتی تعلیمی بورڈ کے صدر رہے

☆ بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے رکن رہے

اعزازات وانعامات:

☆ زبان وادب کی مجموعی خدمات پر ایوان غالب نے ''غالب ایوارڈ'' سے نوازا۔

☆ بہار اردو اکیڈمی پٹنہ نے تنقیدی خدمات پر نقد انعامات سے نوازا۔

☆ حکومت بہار محکمہ راج بھاشا نے ان کی لسانی وادبی خدمات کے اعتراف میں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری ایوارڈ سے سرفراز فرمایا۔(ایک لاکھ روپے)

وفات:

موت کے آخری شب ان کے دل کی کیفیت عجیب سی تھی نا جانے وہ کن کیفیتوں کے اسیر تھے کہ علامہ اقبال کے متعدد غزلیں اور نظموں کو با آواز بلند پڑھ رہے تھے۔ پروفیسر عبدالمغنی کی وفات 5 ستمبر 2006 کو اسپتال میں 6 بج کر 30 منٹ پر حرکت قلب کے بند ہونے کے باعث ہوئی۔ ان کی نماز جنازہ بعد نماز مغرب درگاہ شاہ ارزاں کی مسجد کے صحن میں ہوئی۔ ان کے چھوڑے حافظ عبدالغنی نے نماز جنازہ پڑھائی اور شاہ گنج پٹنہ کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔

حواشی

(1) بھاشا سنگم، سہ ماہی پٹنہ، مشاہیر بہار نمبر حصہ دوم، اکتوبر 2017 تا مارچ 2018، امتیاز احمد کریمی، ص 9

(2) بھاشا سنگم، سہ ماہی پٹنہ، مشاہیر بہار نمبر حصہ دوم، اکتوبر 2017 تا مارچ 2018، امتیاز احمد کریمی، ص 10

(3) بھاشا سنگم، سہ ماہی پٹنہ، مشاہیر بہار نمبر حصہ دوم، اکتوبر 2017 تا مارچ 2018، امتیاز احمد کریمی، ص 16

(4) پرفیسر عبدالمغنی حیات وخدمات، مرتب ڈاکٹر سید احمد قادری، مطبع پاکیزہ آفسیٹ شاہ گنج پٹنہ 2005، ص 6

(5) ڈاکٹر عبدالمغنی ایک سوانحی جائزہ، شبر امام، مشمولہ شخصیت و کردار، ص 125

(6) ڈاکٹر عبدالمغنی ایک سوانحی جائزہ، شبر امام، مشمولہ شخصیت و کردار، ص 13

(7) پرفیسر عبدالمغنی حیات وخدمات، مرتب ڈاکٹر سید احمد قادری، مطبع پاکیزہ آفسیٹ شاہ گنج پٹنہ 2005، ص 15

(8) ڈاکٹر عبدالمغنی ایک سوانحی جائزہ، شبر امام، مشمولہ شخصیت و کردار، ص 120

(9) پرفیسر عبدالمغنی حیات اور خدمات، مرتب ڈاکٹر سید احمد قادری، مطبع پاکیزہ آفسیٹ شاہ گنج پٹنہ 2005، ص 18-19

(10) عبدالمغنی اردو کی ایک عبقری شخصیت، ڈاکٹر محمد شفیع الزماں، پاکیزہ آفسیٹ شاہ گنج پٹنہ، 2013، ص 26-27

(11) ہمارزبان، نئی دہلی ستمبر 2006/عبدالمغنی اردو کی ایک عبقری شخصیت، ڈاکٹر محمد شفیع الزماں، پاکیزہ آفسیٹ شاہ گنج پٹنہ، 2011، ص 28

(12) ماہنامہ پیش رفت، نئی دہلی، دسمبر 2007، ڈاکٹر سید عبدالباری، ص 12

(13) بھاشا سنگم، سہ ماہی پٹنہ، مشاہیر بہار نمبر حصہ دوم، اکتوبر 2017 تا مارچ 2018، امتیاز احمد کریمی، ص 9-10

(14) نقطۂ نظر، دیباچہ، پروفیسر عبدالمغنی، مطبوعہ دی آزاد پریس سبزی باغ پٹنہ 1965، ص جیم تا دال

(15) جادۂ اعتدال، پروفیسر عبدالمغنی، مطبوعہ سن اشاعت 1972، ص، ح

(16) جادۂ اعتدال، پروفیسر عبدالمغنی، مطبوعہ سن اشاعت 1972، ص

(17) پرفیسر عبدالمغنی حیات وخدمات، مرتب ڈاکٹر سید احمد قادری، مطبع پاکیزہ آفسیٹ شاہ گنج پٹنہ 2005، ص 12

(18) پرفیسر عبدالمغنی حیات وخدمات، مرتب ڈاکٹر سید احمد قادری، مطبع پاکیزہ آفسیٹ شاہ گنج پٹنہ 2005، ص 35

(19) عبدالمغنی اردو کی ایک عبقری شخصیت۔ مصنف ڈاکٹر محمد شفیع الزماں، مطبع پاکیزہ آفسیٹ شاہ گنج پٹنہ، 2013 ص 186

(20) ایضاً، ص 28

(21) ایضاً، ص 193-194

(22) ایضاً، ص 187

(23) ایضاً، ص 186

(24) ایضاً، ص 187

(25) ایضاً، ص 191

(26) ایضاً، ص 191

﴿باب دوم﴾

پروفیسر عبدالمغنی کی تنقید نگاری: ایک جائزہ

پروفیسر عبدالمغنی کی تنقید نگاری: ایک جائزہ

پروفیسر عبدالمغنی کے تعلق سے جیسا کہ گزشتہ باب میں بتایا جا چکا ہے کہ وہ ایک کثیر الجہات شخصیت یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان کی ذات اپنے آپ میں ایک انجمن کی حیثیت تھی۔ ایک ماہر تعلیم، تاریخ دان، عالم دین، حافظ قرآن، انگریزی ادب کے استاد، ایک ماہر نقاد، دانشور، اردو تحریک بہار کے سپہ سالار، ماہر اسلامیات، ایک صحافی کی حیثیت سے لوہا منوانے میں کامیاب رہے۔ ہم یہاں اس باب میں پروفیسر عبدالمغنی کی تنقیدی نگارشات، تحریرات، تصانیف کا جائزہ پیش کریں گے۔ ان کی تصانیف کی کل تعداد سید احمد قادری نے اپنی کتاب ''پروفیسر عبدالمغنی حیات اور خدمات'' میں سن اشاعت کے ترتیب وار پینتالیس (45) گنوایا ہے، جدید تحقیق کی روشنی میں تصانیف کی تعداد چھیالیس (46) تک پہونچتی ہے (عبدالمغنی کی وفات کے بعد 2007 میں ایک اور کتاب "انداز تنقید" کے نام سے منظر عام پر آیا)۔ گزشتہ باب میں پروفیسر عبدالمغنی کی کل تصانیف کی فہرست مع ترتیب بہ سن طباعت شامل کر دیا گیا ہے، ہم اس باب میں تنقیدی تصانیف کے تعلق سے بحث کریں گے مناسب ہے کہ ان کی صرف خالص تنقیدی تصانیف (مجموعہ مضامین) ہی ترتیب بہ سن اشاعت ذیل میں پیش کر دیا جائے۔

1۔ نقطہ نظر (1965)

2۔ جادہ اعتدال (1972)

3۔ تشکیل جدید (1976)

4۔ معیار و اقدار (1981)

5۔ تنقید مشرق (1987)

6۔ تصورات (1988)

7۔ اسلوب تنقید (1989)

8۔ تنویر اقبال (1990)

9۔ تنقیدی زاویئے (1993)

10۔ فروغ تنقید (1998)

11۔ انداز تنقید (2007)

☆☆ سید احمد قادری نے اپنی مرتب کردہ کتاب پروفیسر عبدالمغنی حیات اور خدمات میں تنویر اقبال کو مجموعہ مضامین نہیں بلکہ ایک مستقل کتاب میں شامل کیا ہے حالانکہ خود کتاب کے مصنف پروفیسر عبدالمغنی نے تنویر اقبال (1990) کے دیباچہ میں اس مجموعہ مضامین قرار دیا ہے۔

☆☆ 2005 میں عبدالمغنی کے وفات کے بعد سن 2007 شائع ہونے والی مجموعہ مضامین انداز تنقید کے دیباچہ میں بھی مصنف نے تنویر اقبال کو مجموعہ مضامین ہی قرار دیا ہے۔ایک اور بات واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ تنویر اقبال میں شامل تمام مضامین اقبال کے حوالے سے ہی ہیں اس مناسبت سے اسے ہم مستقل تصنیف کہہ سکتے ہیں لیکن ہم یہاں تنویر اقبال کو مجموعہ مضامین میں شامل کریں گے۔

درج بالا تنقیدی تصانیف کا جائزہ پیش کرنے سے پیش تر پروفیسر عبدالمغنی کی تنقیدی شعور وتصور کو سمجھنا نہایت ہی ضروری ہے، ہم یہاں اجمالی طور پر پروفیسر عبدالمغنی کی تنقید بصیرت کا احاطہ پیش کرتے ہیں۔

انیسویں صدی کی آخری دہائی سے عہد حاضر تک کا ارتقائی سفر طے کرنے میں جدید اردو تنقید کو گونا گوں تجربات کی دھوپ چھاؤں سے گزرنا پڑا ہے، مختلف علم وفنون کی ترویج وترقی کے زیر اثر تنقید کا فن خاصا پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے۔متنوع رجحانات سے اردو تنقید کی اثر پزیری اس کے نامیاتی ہونے کا ثبوت دیتی ہے، مگر دیگر ادبیات کی طرح اردو بھی بعض تنقیدی دبستانوں نے اپنے خد وخال متعین کر لیے ہیں، ان میں اکثر دبستانوں کی انفرادی شناخت اب کوئی مسئلہ نہیں، یہی وجہ ہے کہ آج ہم نقادوں کو تاثراتی، مارکسی، جمالیاتی، ہیئتی، نفسیاتی، اسطوری وغیرہ خانوں میں رکھ کر ان کی تنقیدوں کا مطالعہ کرنے کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔

اب تک تنقید کے جتنے اسکول سامنے آچکے ہیں ان کو محض دو مختلف خانوں کے تحت لا کر انہی افادی اور غیر افادی کے نام دیئے جاسکتے ہیں، حالانکہ ہر مکتبہ فکر، ہر تنقیدی اسکول کے لوگ صحت مند ادب یعنی افادی ادب ہی کی بات کرتے ہیں لیکن اگر غائر نگاہ سے دیکھا جائے تو بہت کم ادیب ونقاد ملین گے جو انتہا پسندیوں کے شکار نہیں ہوئے

ہوں، ترقی پسند ادبی تحریک نے بھی گویا استراکیت کی بھول بھلیوں میں پھنس کر اپنی اہمیت کھودی ہے اور اس کے ردعمل میں جھوٹی جدیدیت ابھری ہے وہ بھی انتشار کا شکار ہو کر رہ گئی ہے کیونکہ ان دونوں کے یہاں فکر وفن کے مابعین ربط میں توازن نہیں ہے، ہیئتی اعتبار سے ادب کی تشکیل انہی دوعناصر فکروفن سے مل کر ہوتی ہے۔اگر دونو میں یکسانیت نہیں ہو یعنی اگر ایک طرف ''فکر کی استقامت'' اور دوسری طرف ''فن کی جمالیات'' میں امتیاز برتا جائے توازن برقرار نہیں رہ پاتا ھے، اس لئے تنقید میں عبدالمغنی نے ان دونوں کے درمیان ایک متوازن راستہ نکالا ہے جس کو اخلاقی تنقید یا مشرقی تنقید کا نام دیتے ہیں۔

عبدالمغنی دینی ذہن وفکر رکھتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح زندگی فطری طور پر مذہب سے الگ نہیں ہوسکتی ٹھیک اسی طرح ادب بھی مذہب سے الگ نہیں ہوسکتا ہے، وہ ادب کی ہزار ہا سالہ تاریخی مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ جتنے بھی عالمی ادبی شاہکار ہیں وہ اپنے ماخذ کے اعتبار سے مذہبی رجحانات وتحریکات سے وابستہ ہیں، مغربی ادبیات کی لافانی ولاثانی تصانیف دانتے کی طربیہ خداوندی(Divine Comedy)، گوئٹے کا فاؤسٹ (Foust)اور ملٹن کی فردوس گم شدہ(Paradise Lost)اس کی مثالیں ہیں۔

پروفیسر عبدالمغنی فکری اعتبار سے اقبال کے بہت قریب ہیں اور اسلامی ادب کو ایک مثبت اور تعمیری ادب تسلیم کرتے ہیں، اس طرح وہ ادب کو محض شوق کی چیز نہیں سمجھتے بلکہ صحت مند ادب میں یقین رکھتے ہیں۔

پروفیسر عبدالمغنی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وبیک وقت مشرقی ادب خصوصاً اردو، فارسی ادبیات کے ماہرانہ اداشناس ہیں اور ساتھ ہی انگریزی ادبیات سے براہ راست واقفیت نے ان کے ذہن وفکر میں جلا بخشی ہے، ان کا ادبیات کا مطالعہ وسیع، متنوع اور عالمانہ ہے۔

انھوں نے اپنی تنقیدی نقطہ نظر کی وضاحت میں خاصی تفصیل سے کام لیا ہے، اپنے تنقیدی مضامین کے پہلے ہی مجموعے میں انہوں نے اپنی انفرادی نظریہ تنقید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''میری ادبی تنقیدوں کا بھی ایک نقطہ نظر ہے۔ میں زندگی کی متعلق ایک واضح اور معین تصور رکھتا ہوں، میری خیال میں انسان کی زندگی کسی حیوانی ارتقا کا نمونہ نہیں، یہ ایک الوہی تخلیق کا نتیجہ ہے، چنانچہ آدمی طبعاً ایک ذمہ دار اور شریف مخلوق ہے انسانی سماج کی ترقی جنسی یا معاشی کش مکش کی مرہون منت نہیں، یہ

ترقی سراسر اخلاقی تعاون کا عطیہ ہے ...... میں نے ہر مقالے میں یہ دیکھانے کی کوشش کی ہے کہ فن جمالیاتی وسائل سے کس طرح زندگی کی شراف کو اجاگر کرتا ہے''۔(1)

اپنی تنقیدی مضامین کے دوسرے مجموعہ جادہ اعتدال میں لکھتے ہیں

''میرا تصور تنقید یہ ہے کہ زندگی اور ادب دونوں کو اپنی اپنی جگہ ایک کل اور ایک دوسرے کے ساتھ مربوط سمجھ کر پارہ فن کا تجزیہ وتبصرہ اس انداز سے کرنا چاہیے کہ فن کے تمام عناصر ولوازم کی پوری تصویر ابھرے اور ساتھ ہی ادب و زندگی کی اصلیت وعظمت کی قدریں نکھریں اور سنوریں''۔(2)

تیسرے مجموعہ تشکیل جدید کا بیشتر حصہ ان ہی نظریات کی توضیح میں ہے، چوتھے مجموعے معیار واقدار میں اپنے تنقیدی نظریہ کی قدرے تشریح اس معمول کے مطابق کی ہے جواب تک اپنے ہر مجموعے کی اشاعت کے موقع پر ملحوظ رکھا ہے تا کہ ان کا ادبی موقف قارئین کے سامنے واضح طور پر رہے،معیار واقدار میں میرا نظریہ تنقید کے تحت رقمطراز ہیں:

''میرا نقطہ نظر فکری طور پر دینی اور عملی طور پر اخلاقی ہے ...... میں نے اپنے اردو اور انگریزی مقالات میں بارہا اس خیالات کا اظہار کیا ہے کہ ادب کی حقیقت تو یقیناً اصناف ادب کی متعلقہ ہیئتوں کے لوازم وعناصر ہی کے پیش نظر متعین کی جائیگی، لیکن ادب کی عظمت لازماً کسی اخلاقی معیار سے دریافت کی جائے گی اور اس معیار کی تشکیل ایک دینی نقطہ نظر سے ہی ہوگی اس لئے کہ دین ہی بیک وقت اخلاقیات و جمالیات دونوں کا بہترین اور ایک دوسرے سے ہم آہنگ تصور پیش کرتا ہے اور صحیح معنی میں یہی ایک تصوّر آفاقی بھی ہے اور ابدی بھی، جبکہ دوسری تمام تصوّرات خواہ وہ سائنس اور صنعت کے ہوں یا معیشت اور سیاست کے، یا نفسیات اور عمرانیات کے، سب کے سب زندگی، انسان، فن اور ادب کا ناقص، محدود اور ناپائدار تصوّر پیش کرتے ہیں''۔(3)

درج بالا اقتباسات کی روشنی میں دو باتیں خاص طور پر سامنے آتی ہیں۔اول تو یہ کہ انسانی زندگی کی تزئین

وترتیب میں اخلاقی قدریں سب سے اہم کردار ادا کرتی ہیں اور چونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے اور تنقید نہ صرف ادب کی کسوٹی ہے بلکہ رہنما بھی اس لئے تنقید بھی اخلاقی قدروں سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ اردو تنقید کے نمایاں اسالیب ہیں مثلاً مارکس، نفسیاتی، جمالیاتی، تاثراتی اور متنی وغیرہ ان میں اخلاقی اقدار سے بیگانگی کا رنگ نمایاں ہے اور یہ چونکہ اس کے توسط سے ادب کے کسی ایک پہلو پر زیادہ زور دیتے ہیں، اس لئے ادبی فن پاروں کی صحیح عظمت اور قدر و قیمت کا تعین کرتے وقت افراط وتفریط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ دوم یہ کہ اخلاقی اقدار کا تعلق کسی نہ کسی مذہبی نقطہ نظر سے ہوتا ہے اور فی زمانہ مذہب اسلام سے متعلق اخلاقی قدریں یا بہ الفاظ دیگر اسلام قدریں ہی زندگی کی صحیح تزئین وترتیب کا کام انجام دے سکتی ہیں۔ جہاں تک فنّی اصول وضوابط اور ہئیت کا سوال ہے ان سے محض ادب کی حقیقت اور نوعیت ہی معلوم کی جا سکتی ہے، ادب کو پرکھنے کا کام نہیں لیا جاسکتا یعنی ادب کیا ہے اس سے متعلق کوئی تخلیق کس صنفِ ادب میں شامل ہے، یہ باتیں تو فنّی ہئیت اور لوازماتِ فن کو سامنے رکھ کر کہی جا سکتی ہیں، لیکن ادب کیسا ہے اور کتنا عظیم ہے اس کا فیصلہ بغیر اس میں پیش کردہ اخلاقی اور تہذیبی اقدار کی جستجو اور پرکھ کے نہیں کیا جا سکتا اور یہی تنقید میں توازن کی صورت ہوگی۔

ان نکات کے پیش نظر پروفیسر عبدالمغنی کا جو تنقیدی نقطہ نظر ہمارے سامنے آتا ہے، اس میں ادب کی خارجی ہئیت اور فنّی لوازمات سے زیادہ اہمیت ادب میں پیش کردہ ان اخلاقی قدروں کو دی گئی ہے جو تزئین وترتیب میں معاون ثابت ہوتی ہے ۔ یہ تنقیدی نقطہ نظر اردو ادب کے لئے نیا ہے لیکن عالمی ادب میں اس کی مثالیں ناپید نہیں ہیں ۔ مشہور انگریزی ادیب و ناقد ٹی ۔ ایس۔ ایلیٹ بھی اپنے دور آخر میں ادب کو ایک مخصوص اخلاقی نقطہ نظر کے پس منظر میں دیکھنے کا حامی ہو گیا تھا، اس کے اثرات پروفیسر عبدالمغنی کے یہاں بھی ملتے ہیں، ٹی ۔ ایس ۔ ایلیٹ نے اپنے مشہور مضمون ’’ Religion and Litrature ‘‘ میں اس نکتے پر زور دیا ہے کہ عظمی ادب میں فنّی لوازمات کے علاوہ ایک نظریہ بھی موجود ہوتا ہے پروفیسر عبدالمغنی بھی اس بات کے مدّعی ہیں کہ ادب میں جمالیات کا کوئی تخیل اخلاقیات سے بیگانہ نہیں ہوسکتا۔

یہاں پر سوال ہوسکتا ہے اور ہوتا رہا ہے کہ آخر اخلاقیات کا پیمانہ کیا ہے؟ اخلاقی قدریں تو عہد اور ماحول کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں، پھر ان کی بنیاد پر ترتیب دیئے گئے اصولِ تنقید دائمی اور مستقل کیسے ہو سکتے ہیں، اس اعتراض کا

یہی جواب ممکن ہے کہ اخلاقی قدریں اگر کسی مادی نظام حیات سے وابستہ ہوں تو ان میں تغیر ہوسکتا ہے لیکن اگر انہیں کسی مستقل روحانی نظریہ حیات سے وابستہ کر دیا جائے تو ان کی حیثیت بھی مستقل ہو جا سکتی ہے ۔ ایلیٹ نے جن اخلاقی قدروں پر زور دیا انہیں براہِ راست عیسائیت سے متعلق کر دیا ۔ پروفیسر عبدالمغنی کے پیش نظر ایک مکمل اور آخری نظام حیات دین اسلام کی شکل میں موجود ہے اس لئے وہ ادب میں انہیں اخلاقی اقدار کی جستجو کے خواہاں ہیں جو اسلامی نظریہ حیات سے متعلق ہیں ادب کے فنّی محاسن کا منکر ایلیٹ بھی نہیں تھا اور پروفیسر عبدالمغنی بھی نہیں لیکن جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے ۔ کہ بغیر کسی داخلی خوبی کے محض خوشنمائی کو وہ ہنر نہیں عیب سمجھتے ہیں ۔ یہاں پر ایک اور نکتہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے ۔ انگریزی یا مغربی ادب میں ایلیٹ واحد تنقید نگار نہیں ہے جس نے ادب میں اخلاقی قدروں کی جستجو کی ہے اور بھی ایسے نقاد ہیں جو ادب کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتے رہے ہیں، میتھو آرنلڈ کی مثال ہمارے سامنے ہے جس نے ادب میں اعلیٰ سنجیدگی (High Seriousness) کی اہمیت پر زور دیا ہے، آرنلڈ کے مضمون '' The Study Of Poetry '' سے واضح ہو جاتا ہے کہ مزکورہ بالا Seriousness کو آرنلڈ نے وسیع تر معنوں میں استعمال کیا ہے اور اس کے سرحدیں عیسائیت کی تشکیل کردہ اخلاقی قدروں سے مل جاتی ہیں ۔

پروفیسر عبدالمغنی نے گرچہ اپنے ابتدائی تنقیدی مجموعے میں سے اس امر کی وضاحت نہیں کی تھی کہ ان کا مخصوص تنقیدی نقطہ نظر اسلام کی اخلاقی قدروں سے براہ راست رشتہ رکھتا ہے لیکن اب یہ بات واضح ہو چکی ہے . مذہب کی آفاقیت اور ہمہ گیری سے انکار نا ممکن ہے اس لئے ایلیٹ اور آرنلڈ کی تحریروں کے بارے میں بھی گرچہ بحث ہوتی رہی ہے لیکن ان کے نظریہ تنقید کو اب تک رد نہیں کیا جا سکا ہے ۔ پروفیسر عبدالمغنی کو ایک فوقیت یہ حاصل ہے کہ ان کی پسندیدہ اخلاقی قدریں عیسائیت جیسے رد کردہ نظام حیات ک مقابلے میں ایک زیادہ مکمل اور جدید نظام حیات یعنی ''اسلام'' سے رشتہ رکھتی ہیں، بہر حال اس بات کی وضاحت کے بعد پروفیسر عبدالمغنی ادب پاروں کی اہمیت اور عظمت کا تعین دین اسلام کی اخلاقی قدروں سے ہم آہنگ ایک مخصوص اخلاقی معیار سے کرتے ہیں ۔

ادب کے تعلق سے اپنے خیالات واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ادب کی ہئیت دو عناصر سے مرکب ہوتی ہے، ایک فکر اور دوسرا فن ۔ یہ

دونوں عناصر ادبی تشکیل کے لئے یکساں اہمیت رکھتی ہیں، تخلیقی عمل کے اندر ان میں کسی ایک کو بھی دوسرے پر کسی قسم کی فوقیت اور ترجیح نہیں دی جاسکتی ہے۔ لہٰذا ادب کی زندگی اور ترقی کے لئے ناگزیر ہے کہ فکر وفن کے درمیان کامل اعتدال اور توازن ہو۔ اس میں ایک طرف فکر کی استقامت ہو تو دوسری فن کی جمالیات، دونوں ایک دوسرے کے بالکل برابر بلکہ دونوں ایک دوسرے میں اس درجہ پیوست ہو کہ من وتو کا کوئی فرق باقی نہ رہے اور ادبی کل اپنے قاری کو بیک وقت مسرت اور بصیرت، نشاط اور دانش، آرزو اور کاوش کا سامان فراہم کرے "۔(4)

درج بالا اقتباس میں تصّورادب کی اس قدر جامع وضاحت کی گئی ہے کہ مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔ ان کے خیال میں ادب فکر وفن کی حسین آمیزش کا نام ہے یہاں تک انہوں نے جو کچھ بھی کہا ہے اس پر اردو تنقید کے متعدد مشاہیران سے پیش تر روشنی ڈال چکے ہیں لیکن ایسے لوگ غالباً کم ہے جو ادب کی اساس ایسے فکری عناصر پر دیکھتے اور دیکھنا چاہتے ہوں جن میں استقامت پائی جائے .اس تصّورادب سے ایک مغالطے کی گنجائش نکل سکتی ہے کہ اگر کوئی ادب پارہ فن کی جمالیاتی سطح پر معیاری ہو لیکن اس میں فکری استقامت کی عدم موجودگی ہو تو پروفیسر عبدالمغنی غیر جمالیاتی معیار واقدام کے احترام میں اسے ادبی اور غیر معیاری قرار دیں گے حقیقتاً ایسا نہیں، وہ اس مغالطے کی گنجائش ہی نہیں رہنے دیتے لہٰذا لکھتے ہیں:

" میں ادیب اور شاعر کو سب سے پہلے ایک ادیب اور شاعر ہی کی حیثیت سے لیتا ہوں اور حتی الوسع اس کے فن کا معروضی تجزیہ کر کے اس کے عوامل و عناصر دریافت کرتا ہوں، اس کے فن کو ادب کی مجموعی روایت کے پس منظر میں رکھ کر اس کی نوعیت، حقیقت اور اہمیت پر بحث کرتا ہوں .اس کے بعد زیرتبصرہ فن کے متعلق فیصلہ اپنے خاص تنقیدی موقف سے معروف ومسلم انسانی واخلاقی قدروں کی روشنی میں کرتا ہوں اور اس فیصلے کے مطابق ادب اور تہذیب کی تاریخ میں فن کا مقام متعین کرتا ہوں"۔(5)

پروفیسر عبدالمغنی ادب کو پہلے ادب ہی تسلیم کرتے ہیں، ادب پاروں کا تجزیہ معروضی انداز میں کرتے ہیں

جیسا کہ ابھی ابھی انہیں نے اعتراف کیا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی واضح کرتے ہیں:

''ادب کے نام پر پیش کی جانے والی ہر وہ چیز غلط ہے جو ثقافت، تہذیب اور زندگی کے اقدار و اصول اور ادب سے ٹکرانے والی اور ان کی تردید و تخریب کرنے والی ہو ۔ چنانچہ ادب میں جمالیات کا کوئی تخیل اخلاقیات سے بیگانہ نہیں ہوسکتا بلکہ اخلاقیات سے بے نیاز ہوکر جمالیات کا کوئی مطلب ہی نہیں رہ جاتا۔فحاشی اور بدکاری کو کتنے ہی خوبصورت پردوں میں پیش کیا جائے ان کی کراہیت اور قباحت کو گوارا نہیں بنایا جاسکتا، خوشنمائی بغیر کسی خوبی کے فریب محض ہے جس سے تسکین و مسرت کا احساس کسی صحت مند ذہن کو نہیں ہو سکتا''۔(6)

ان بیانات کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ادب کا تخلیقی شعبہ ہو یا تنقیدی، پروفیسر عبدالمغنی ہر جگہ ایک خاص مقصد کے متقاضی ہیں ۔ وہ تخلیقی و تنقیدی دونوں کا ایک افادی اور مقصدی نظریہ رکھتے ہیں اور اس افادیت کا براہ راست تعلق اخلاق تعمیر دین اسلام کے معیار پر ہونی چاہئے، تنقید کے تعلق سے لکھتے ہیں۔

''میرا تصور تنقید یہ ہے کہ زندگی اور ادب دونوں کو اپنی اپنی جگہ ایک کل اور ایک دوسرے کے ساتھ مربوط سمجھ کر پارہ فن کا تجزیہ و تبصرہ اس انداز سے کرنا چاہیے کہ فن کے تمام عناصر و لوازم کی پوری تصویر ابھرے اور ساتھ ہی ادب و زندگی کی اصلیت اور عظمت قدریں نکھریں اور سنوریں۔۔۔اس کے بارے میں میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ زندگی اور ادب دونوں کی سلیت اور ہم آہنگی کا ضامن ہے، یہ دونوں کا پورا تصویر پیش کر تاھے۔۔۔ ۔اس معیار کاملہ پر دوسرے تمام اسالیب کی صداقتوں کو بھی خام مواد اور وسائل کار کے طور پر جمع کر لیا جاسکتا ہے، اس طرح کہ محور و مرکز اخلاقی تصور ہو اور باقی تما تصورات اس کے ماتحت نقطے اور زاویے ہوں اگر اس ترتیب سے کام لیا جائے تو تنقیدی کی جامعیت اقتصادیات، نفسیات، جمالیات، تاثرات اور متن سبھی ان کی متعینہ حدود میں رکھ کران کا صحیح استعمال کرسکتی ہے، اس طرح ادب کے مطالعے کے

> لئے ہمیں ایک ایسا ترکیبی انداز میسر آ سکتا ہے جو زندگی اور فن کی تمام کرنوں کو سمیٹ اور سمو کر مسرت اور بصیرت کا ایک آفتاب تازہ تخلیق کر سکتا ہے''۔
> (7)

یہاں ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ آیا نظریہ قابل تسلیم بھی ہے جواباً کہہ سکتے ہیں کہ تنقید کے مختلف اسکولوں کا پایا جانا کچھ تو مختلف طبائع کی انفرادی خصوصیات کا نتیجہ ہیں، اور کچھ حد تک جدید علوم وفنون کی ترویج وترقی کا بھی جیسا کہ ابتدائی سطور میں اشارہ کیا جا چکا ہے . بہر حال یہ تنقیدی مکاتیب باہم مختلف ہونے کے باوجود اپنے اپنے دائرے میں تناسب کی کمی وبیشی کے ساتھ اپنی اہمیت رکھتے ہیں، فرق صرف ترجیحی عناصر وعوامل کا ہوتا ہے اور بس مزید وضاحت کے لئے یوں سمجھنا چاہیے کہ بعض ناقدین سماجیاتی اور معاشیاتی ترجیحات جیسے خالص خارجی عوامل کو اپنے تصّورات میں اولیت دیتے ہیں تو بعض ناقدین نفسیاتی مضمرات کو بنیادی نقطہ بنا کر ادب پاروں کا تحلیل و تقدیر(Evaluation) کرتے ہیں , لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مادی وخارجی عناصر کو اہم مان کر غیر مادی و داخلی قدروں سے مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے سلاست روی کے ساتھ تنقیدی مطالعات پیش کر سکیں گے، قصداً ایسا کیا بھی جائے تو انجام پراگندہ ہوگا۔

اس نکتے پر غور کرنے کے بعد پروفیسر عبدالمغنی نے اپنے نظریہ کی حمایت میں ایک اعتدال پسندانہ جواز ڈھونڈ نکالا ہے جس سے انہیں اپنے موقف کو مستحکم بنانے میں بھی مدد ملتی ہے ساتھ ساتھ دوسرے میلانات کے احترام کا بھی جواز اس سے نکل آتا ہے، رقمطراز ہیں:

> ''علم، فن، ادب اور تنقید میں اعتبار صرف اس بات کا ہوتا ہے کہ ایک شخص نے اپنی کاوش کا جو نتیجہ اور نمونہ پیش کیا ہے وہ اس خالص دائرے کے لوازم و آداب کے لحاظ سے کیسا ہے جس میں یہ نتیجہ اور نمونہ پیش کیا ہے۔ اقبال کی شاعری میں اسلام، ٹیگور کی شاعری میں ویدانت اور ٹی . ایس . ایلیٹ کی شاعری اور تنقید میں مسیحیت ان کی ادبی کاوشوں کے نتیجے اور نمونے کے لئے کوئی عیب تو نہیں؟ ورنہ ان کاوشوں پر سرے سے کوئی بحث ہی فضول ہوگی . اسی طرح میری تنقید میں اسلام ایک وصف ہو سکتا ہے عیب نہیں''۔(8)

نقطہ نظر کے بعض مضامین ان کے مخصوص نظریہ تنقید کی واضح جلوہ گری کے سبب مطالعے کے لئے اہم بن جاتے ہیں، اخلاقیات کے مخصوص اصولوں کو بروئے کار لانے کے سبب بعض اوقات ایک ہی موضوع یا فنکار کے چند پہلوان کی نظر میں قابلِ تعریف ہوتے ہیں اور چند دوسرے پہلو کی نشاندہی میں ٹھہرتے ہیں لیکن پروفیسر عبدالمغنی ان دونوں پہلوؤں کا ذکر کرتے ہیں اور کسی ایک پہلو کی نشاندہی میں افراط وتفریط سے کام نہیں لیتے۔ احتشام حسین کی تنقید نگاری اس تنقیدی رویئے کی واضح مثال ہے، اس کے باوجود ان کی تنقیدی قدر و قیمت متعین کرتے وقت پروفیسر عبدالمغنی کسی جذباتیت کا شکار نہیں ہوتے انہیں اس حقیقت کے اظہار میں کوئی تامل نہیں وہ لکھتے ہیں:

> ’’احتشام حسین کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کافی غور و فکر کے بغیر کچھ نہیں لکھتے، انہیں اپنی ذمہ داری کا شدید احساس ہے ان کے خیالا میں ہم آہنگی اور استواری پائی جاتا ھے‘‘۔(9)

پروفیسر عبدالمغنی مانتے ہیں کہ اشتراکی تحریک کو ادبی سطح پر متعارف کرانے میں احتشام حسین نے اہم کردار ادا کیا، اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ احتشام حسین کے سائنٹیفک اسلوب نے اردو زبان و ادب کو بہت سجایا سنوارا، وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ مواد اور ہیئت، آزاد نظم اور تنقید وغیرہ کے نظریاتی موضوعات پر احتشا حسین نے بڑی سلجھی ہوئی اور بیلاگ باتیں کہی ہیں جو بہت کم ناقدین نے کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ احتشام حسین کے تنقید نگاری پر بات کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ’’ان کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ مارکسی نظریہ ادب کے طلسم میں گرفتار ہونے کے باوجود وہ غالب واقبال جیسے ماورائی فن کاروں کی قدر و قیمت کو بھی سمجھ سکتے ہیں اور تجزیاتی طور پر سمجھا سکتے ہیں . یہ بات ان کے بلن ذوق ادب اور پختہ شعور کی محکم دلیل ہے ان سے ان کی تنقیدی نظر کی گہرائی اور گیرائی کا ثبوت ملتا ہے‘‘۔(10)

احتشام حسین، پروفیسر عبدالمغنی پختہ تنقیدی شعور، اخلاقی نظریہ تنقید، تنقیدی نقطہ نظر کی وضاحت، فنکار اور فن پارہ کی تجزیہ ووفاداری، تعمیری تنقید سے متاثر ہو کر اعتراف کرتے ہیں:

> ’’ حال میں ایک نسبتاً نئے ادیب عبدالمغنی صاحب کا ایک مضمون میری

تنقیدی کاوشوں کے متعلق رسالہ " ادیب " علیگڑھ میں شائع ہوا ......اس
مضمون کو پڑھ کر مجھے اس لئے تسکین ہوئی کہ اس کے لکھنے والے نے ہمدردانہ
میرے خیالات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، اور جہاں اس کے ذہن یا عقیدے نے
اتفاق کی گنجائش نہیں پائی وہاں اختلاف کیا ہے''۔(11)

نقطہ نظر کے دیگر مضامین مثلاً ''اقبال اور شخصیتیں''، ''موازنہ اقبال و غالب'' یا ''اقبال کا فن'' میں بھی تنقید کا وہی انداز کارفرما نظر آتا ہے جو مزکورہ بالا اقتباسات میں ہے جس کی طرف احتشام حسین نے اشارہ کیا ہے یعنی پہلے فن کار کے تخلیقی رویئے اور اس کے نظریات کی تفہیم کی کوشش ہوتی ہے اور اس کے بعد اپنے مخصوص اخلاقی معیار سے پرکھا جاتا ہے جیسا کہ پہلے کہا ہے اس عمل کے دوران روایت سے استفادے اور ذاتی صلاحیتوں کے اظہار کو سامنے رکھا جاتا ہے۔

اسرارالحق مجاز کو عاطور پر باغی شاعر کی حیثیت سے جانا جاتا رہا ہے، اور کم از کم 1960ء سے قبل تو یقیناً انہیں صرف اسی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا لیکن عبدالمغنی نے اپنے مخصوص نقطہ نظر سے مجاز کا مطالعہ کیا جائزہ لیتے ہوئے واضح کیا کہ روایت کا احترام مجاز کے یہاں پوری طرح موجود ہے اور انہوں نے بغاوت کو محض ایک باریک لبادے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ مجاز کی رندانہ اداوں کے باوجود ان کی شاعری پروفیسر عبدالمغنی کی نگاہ تنقید سے غالباً اسی لئے خراج تحسین وصول کر لیتی ہے کہ اس میں اخلاقی قدروں کا زبردست احساس پایا جاتا ہے اور مجاز کی بے تابیاں متوسط مسلم سماج کے اخلاقی حدود سے باہر نہیں جاتیں۔

تیسرا تنقیدی مجموعہ ''تشکیل جدید'' کے مضامین میں ''عالمی ادب میں اقبال کا مقام'' اور ''اقبال اور اسلامی فکر کی تشکیل جدید'' سب سے اہم مضامین ہیں جن میں پروفیسر عبدالمغنی کا تنقیدی رویّہ واضح طور پر سامنے آتا ہے۔ مشرقی شعراء مثلاً میر، غالب، کالی داس، ٹیگور، امرائالقیس، حافظ، سعدی اور خیام بشمول رومی کے علاوہ مغربی شعراء میں دانتے، شیکسپیئر اور گوئٹے سے مقابلہ کے بعد وہ اقبال کو صرف دو بنیادوں پر دنیائے شاعری کی سب سے اہم شخصیت قرار دیتے ہیں۔

اول تو یہ کہ اقبال نے مشرقی و مغربی تمام ہی ادبیات کی بہترین روایات اور عظیم ترین تجربات کو اپنی منفرد تخلیقات میں ترکیب دے کر ایک بہتر اور عظیم تر فنکاری کا ثبوت دیا ہے ساتھ ہی انہوں نے شعر و ادب کو پیش آنے

والے مشکل ترین مسائل کو اپنی فنّی ریاضت اور فکری بلوغت کے بل پر موثر ترین وسائل شعری میں تبدیل کر دیا اور دوم یہ کہ اقبال نے اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید اس انداز سے کی ہے کہ اسے عہد حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے سراسر آفاقی سطح پر پیش کیا ہے ان کا پیش کردہ یہ نظام فکر اسلامی مسلمات پر مبنی ہونے کے باوجود جدید ترین انسانی تحقیقات پر مشتمل ہے، یعنی اقبال نے اسلامی اصولوں کی ترجمانی عصر حاضر کی اصلاحات میں کیا ہے۔

پروفیسر عبدالمغنی کا دستاویزی مقالہ ادبی قدروں کی تشکیل جدید ان کا اہم ادبی کارنامہ ہے، دراصل یہ مقالہ لکھ کر انہوں نے اردو ادب پر احسان کیا ہے، تشکیل جدید میں مختلف عنوانات مثلاً ادب کی پہچان، فکر و فن، جدت و قدامت، ادبی تشکیل جدید کے اسباب و عوامل، شاعری کی تشکیل جدید وغیرہ پر موثر و منطقی بحث کی ہین۔ انہوں نے مختلف سوالات جیسے ادب کیا ہے؟ ادب کی حدود اور صفات کیا ہیں؟ اور انسانی زندگی میں ادب کا کیا مقام ہے؟ ادیب کیوں لکھتا ہے؟ جدت اور قدامت سے کیا مراد ہے؟ معیار ادب میں انفرادیت و رومانیت اور روایت و کلاسکیت کا باہمی ارتباط کہاں تک ہونا چاہئے؟ ادبی تشکیل کی بنیادی ضرورت کیا ہے؟ اقبال کو اس موضوع سے کہاں تک دلچسپی تھی؟ ان کی تحریر کردہ اقدار تجدید کا کس نظام فکر سے تعلق ہے؟ نئی شاعری کے مطالبات کیا ہیں؟ اور اس کا تجربہ کیسے ہوسکتا ہے؟ پر مدلل گفتگو کی ہے اور بتایا ہے کہ ادبی قدروں کی تشکیل جدید کس طرح کی جاسکتی ہے . مزکورہ سوالات کے سلسلے میں پروفیسر عبدالمغنی کے جوابات کا مفہوم اجمالی طور پر یہاں بیان کیا کیا جا رہا ہے تا کہ ان کی ناقدانہ شعور و پختگی کا اندازہ ہو سکے۔ ہر تحریر ادب نہیں۔ ادب کی تشکیل دو عناصر فکری و فن سے مل کر ہوتی ہے۔ جب یہ عناصر اعلیٰ درجے کے ہوں گے تو ان کے درمیان کامل آہنگ پیدا ہوگا۔ ادب میں خیالات کا اظہار موثر اور دلچسپ انداز میں ہونا چاہئے۔ ہئیتی اعتبار سے اس میں اصول و قواعد کی پابندی لازمی ہے، نیز اس کے لئے کسی موضوع کا ہونا بھی ضروری ہے۔ موضوع کو فکر سے تعلق ہوتا ہے اور فکر ہی سے مقصد کا وجود ہے اور پھر مقصد اخلاقی لباس پہن کر انسانیت کے فروغ دینے میں ایک کلیدی رول کرتا ہے، ایک ادیب خواہ اپنی تسکین کے لئے لکھتا ہو لیکن فن کا تعلق قاری سے ایک گزیر امر ہے اور فکر کا تعلق خود ادیب سے ہوتا ہے اس لیے فکر و فن کے درمیان باہمی رابط کا ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا ادیب کو اپنے ادب میں ایک خوبصورت مؤثر اور قابل فہم ہئیت اپنانی ہوگی۔ جدت و قدامت کے سلسلے میں مختلف رویئے مثلاً ''روشن خیالی بہ مقابلہ تاریک خیالی، کوتاہ اندیشی بہ مقابلہ دور اندیشی، پیش قدمی بہ مقابل

پس ماندگی، اجتہاد بہ مقابلہ رسمیت، روایت بہ مقابلہ بغاوت'' وغیرہ کی بحثیں آخر کار نئے اور پرانے کے مقابلے پر رک جاتی ہیں۔ جدت وقدامت کا تصور جامد نہیں بلکہ آج کی ہرن ءتخلیق رومان وترقی کے باوجود کل کلاسیکی ہوجاتی ہے اور اپنی انفرادیت ومعنویت روایت کے دائرے ہی میں بن پاتی ہے، اس لئے زمانے کا تصور روایت واقدار کی شکل میں بروئے عمل آتا ہے، روایت وانفرادیت کے اشتراک سے ایک نئی اور توانا روایت ظہور میں آتی ہے، جس کو ثقافت سے تعبیر کرتے ہیں اور اقتدارِحیات، روایت وثقافت کے اندر ہی پروان چڑھتی ہیں، اقتدارِحیات کو اخلاقیات سے گہرا تعلق ہے اور اخلاقیات کے خانے میں مروّت، شجاعت، سخاوت، ایثار، تحمّل، ایمانداری، رواداری، حیا، اخوت، حمیت وغیرت، حرّیت وشرافت، ہمدردی وغم خواری، مساوات وغیرہ جیسے جواہر ہوتے ہیں، اس طرح کسی ادب کا ارتقاء بغیر اجتہاد واستحکام کے ممکن نہیں، یہ اسی وقت ہوگا جب ادب کے اندر عمدگی، نفاست، اعلی متانت، جمال وزیبائی، لطف وفصاحت، بلاغت ونورانیت کے عناصر موجود ہوں گے۔ لہٰذا عبدالمغنی معیاری ادب کے لئے یہ فیصلہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

> ''ادب میں انفرادیت ورومانیت اور روایت وکلاسکیت کا عضویاتی ارتباط ہونا چاہیئے تاکہ ایک تازہ خلاق ذہن میں فکر وخیال کے جو پیکر ابھریں وہ پیدا ہونے سے پہلے ہی نہ مرجائیں بلکہ ایک تناسب ومتوازن اسلوب، مناسب وموزوں نقوش وعلائم کے ساتھ زندہ وتوانا شکل میں بروئے اظہار آئیں''۔
> (12)

اردو کی نظم مغربی تقلید میں تین حصوں میں تقسیم کی گئی، پابند، معریٰ، اور آزاد، پابند نظم کے متعلق جدیدیوں میں یہ خیال ابھر آ کہ عروض کی پابندی محض مصنوعی چیز ہے، اس کے ذریعے وہ اپنے فطری خیالات کا اظہار پوری طرح نہیں کر سکتے۔ اس لئے انہوں نے نظم میں آزاد یا معریٰ ہئیتوں کا استعمال شروع کیا. لیکن یہ دونوں ہئیتیں اردو شاعری سے کس طرح میل کھاتیں جبکہ اس کا مزاج اصلاً مشرقی ہے. دوسرے اردو شاعری کا عروض اور اس کی موسیقی مغربی اور انگریزی شاعری کے عروض اور موسیقی سے قطعاً مختلف ہے مشرقی موسیقی میں ہم آہنگی اور ہمواری پائی جاتی ہے اور یہی ارتعاشات عروض میں منعکس ہیں جن سے الگ ہوکر کوئی بھی ہئیتی تجربہ کامیاب نہیں ہوسکتا، معریٰ اور آزاد نظموں کا مواد انسانی ذہن کا زوال وانتشار ہے جو فن شاعری کو ہلاکت خیزی کی طرف لے جاتا ہے.

لہٰذا کوئی بھی تجربہ شعر کے بنیادی آہنگ اور زبان کی تہذیبی پس منظر سے الگ ہٹ کر کامیاب نہیں ہوسکتا دوسرے شاعر کی ذہنی کیفیت میں ہمواری اور متانت بھی ہونی چاہئے۔

مذکورہ بالا جوابات کی روشنی میں یہ بات تو کہی جاسکتی ہے کہ پروفیسر عبدالمغنی میں زبردست تنقیدی صلاحیت موجود تھی، بالعموم تنقید میں وہ غلط بیانی سے کام نہیں لیتے بلکہ حقائق کی روشنی میں ان کا تجزیاتی عمل ہوتا ہے وہ کوئی بات بغیر دلیل وثبوت کے نہیں کہتے . پہلے مغربی نقادوں، ادیبوں اور مفکروں کے حوالے سے بحث کرتے ہیں، پھر منطق کی روشنی میں وہ اپنا کوئی فیصلہ کرتے ہیں۔ وہ معیار واقدار کے اکثر مضامین میں مفقود ہے لیکن یہاں نقاد کے تنقیدی نقطہ نظر کے عملی نمونے زیادہ واضح طور پر سامنے آتے ہیں ''فن اور ناقد''، افسانے میں ''ہیئتی تجربے'' اور'' ہم عصر افسانوں میں اقدار کی اہمیت'' وغیرہ ایسے مضامین ہیں جو نظریاتی بحثوں پر مشتمل ہیں '' آغا حشر اور شیکسپئر''،'' جدید اردو شاعری میں فیض کا مقام''،''یوسف حسین خاں۔۔۔عالم یا ناقد؟'' اور''اختر اورینوی بحثیت نقاد'' وغیرہ میں تنقید کی عملی صورت سامنے آتی ہے اور عبدالمغنی کی اخلاقی تنقید نگاری کے وہ تمام پہلو واضح ہوجاتے ہیں جن کا ذکر ہوتا رہا ہے۔

بہرکیف عبدالمغنی کی تنقید کی ایک خوبی ان کا اسلوب ہے، وہ تنقیدی زبان استعمال کرتے ہیں، طرزِ تحریر میں بے پرواہی نہیں برتی جاتی، لفظوں کے استعمال کا خصوصی خیال رکھتے ہیں، کسی کی گرفت کے سلسلے میں ایسے فقرے استعمال کرتے ہیں جو اخلاقی حدود کے اندر ہوتے ہیں اور جہاں صبر وضبط سے کام لیا جاتا ہے۔ شگفتہ بیانی پروفیسر عبدالمغنی کا طرہ ءامتیاز ہے۔ بالعموم ان کی تحریر تصنع سے پاک ہوتی ہے۔ رواں دواں فقروں میں ایک خاص قسم کی تازگی محسوس ہوتی ہے اور اسلوب میں تسلسل پایا جاتا ہے۔ ناہمواری کی شکایت ان کے یہاں مشکل سے ملیں گی لیکن جب بھی وہ اسلام کی بات کرتے ہیں تو جوش میں آجاتے ہیں اور اپنی جذباتی وابستگی کی وجہ سے اسلامیت کے افادی پہلو پر ایک طویل گفتگو کرتے ہیں جہاں خطابت کا رنگ دیکھنے میں آتا ہے۔ بلاشبہ یہ بات کھٹکتی ہے پھر بھی وہ نعرہ بازی پر نہیں اترتے جیسا کہ مارکسی نقادوں کے یہاں یہ عام کمزوری ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی اپنی وسعت علمی ونظری کے سبب خالص تنقیدی شعور رکھتے ہیں اور بالعموم جذباتی اسلوب سے پرہیز کرتے دکھائی دیتے، وہ اپنے تجزیاتی عمل کے ذریعے ادنیٰ واعلیٰ، پست وبلند کا معیار تعین کرتے ہیں۔ نثری وشعری اقتباسات موقع ومحل کا لحاظ

کرتے ہوئے پیش کرتے ہیں۔ ان کے نثری لب ولہجہ سے علمیت کا رعب نہیں پڑتا بلکہ شگفتہ تحریر سے قاری کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اگرچہ وہ انگریزی زبان وادب کے استاد ہیں اور انگریزی زبان وادب کا اچھا خاصا مطالعہ رکھتے ہیں لیکن تنقیدی میدان میں وہ اس نقالی کو جائز نہیں سمجھا۔

مجموعی اعتبار سے پروفیسر عبدالمغنی کا طائر انتقاد محض فضائے تخیل ہی تک اڑان بھر کر نہیں رہ جاتا ان کی حد پرواز مادیت سے ماورائیت تک پھیلی ہوئی ہے، ان کی تنقید ادبی اقدار کے ساتھ حیات وکائنات کے ٹھوس حقائق و مسائل سے بھی اپنا رستہ استوار کرتی ہے۔ المختصر ان کے تنقیدی افکار میں سنجیدگی اور متانت ہے تو طرز بیان میں نفاست لطافت اور شفاہت کی خوبیاں بھی موجود ہیں اور اپنی فکری قماش میں ان کی تنقید خواجہ الطاف حسین حالی، امداد امام اثر، مسعود حسین رضوی ادیب، کلیم الدین احمد، سید احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری کا سا وزن وقار رکھتی ہے تو ان کا اسلوب نگارش محمد حسین آزاد، آل احمد سرور، اختر اورینوی کے طرز بیان سے قریب ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ان کے یہاں فکر واسلوب دونوں شیر وشکر ہو گئے ہیں۔ پروفیسر عبدالمغنی کی تنقید ادبی تنقید کے افادی نظریہ وعمل کا ایک واضح نقطہ ہے۔

اب ہم ذیل میں پروفیسر عبدالمغنی کے خالص تنقیدی تصانیف (مجموعہ مضامین) کا ترتیب وار بہ سن اشاعت فرداً فرداً جائزہ لیں گے۔

نقطہ نظر (1965): نقطہ نظر پروفیسر عبدالمغنی کے مضامین کا پہلا مجموعہ ہے 1965 میں پہلی بار کتاب منزل، سبزی باغ پٹنہ نے شائع کیا۔ نقطہ نظر میں شامل مضامین 1950ء سے 1964ء کے درمیان مختلف مواقع پر لکھے گئے ہیں۔ جو اس وقت ہندو پاک کے معتبر رسالوں شائع ہو چکے تھے . نقطہ نظر میں کل چودہ مقالات مختلف عناوین سے درج ذیل ہیں۔

1۔ اقبال اور شخصیتیں

2۔ مجاز ایک روایت پرست شاعر

3۔ افسانے میں تکنیک

4۔ ابوالکلام کے اسلوب کی چند نادر خصوصیتیں

5۔ جدید اردو تنقید

6۔ احتشام حسین کی تنقید نگاری

7۔ کلیم الدین احمد کی ناقدانہ حیثیت

8۔ جگر کی شاعری

9۔ اردو افسانے میں خواتین کا حصہ

10۔ اقبال کا فن

11۔ اقبال کی فارسی شاعری

12۔ موازنہ اقبال و غالب

13۔ ڈرامانگاری

14۔ اردو خطوط نگاری میں ابوالکلام کا مرتبہ.

مقالہ بعنوان ''اقبال کا فن'' رسالہ ''نقوش'' میں اقبال صدی کے موقع پر شائع ہو کر اہل علم و دانش سے داد و تحسین حاصل کر چکا تھا۔ ادبی دنیا میں اس مضمون بالخصوص اقبال شناسی میں ایک نئے پہلو کا اضافہ ہوا اور ایک نئی جہت سے اقبال کو پڑھنے و سمجھنے کا رجحان سامنے آیا، بعد میں اسے نقطہ نظر میں شامل کر دیا گیا۔ اس مجموعہ میں شامل کر نے سے قبل ''موازنہ اقبال و غالب'' بھی رسالہ ''معارف'' میں شایع ہو چکا ہے۔ کتاب کی ابتدا میں پروفیسر عبدالمغنی نے اپنا تنقیدی نظریہ و تصّور کو نقطۂ نظر کے تحت دیباچہ میں رقمطراز ہیں.

> ''میری ادبی تنقیدوں کا بھی ایک نقطہ نظر ہے۔ میں زندگی کے متعلق ایک واضع اور متعین مقصد رکھتا ہوں۔ میرے خیال میں انسان کی زندگی کسی حیوانی ارتقاء کا نمونہ نہیں یہاں ایک الوہوی تخلیق کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ انسان طبعًا ایک ذمہ دار اور شریف مخلوق ہے۔ انسانی سماج کی ترقی جنسی یا معاشی کشمکش کی مرہون منت نہیں۔ یہ ترقی سراسر اخلاقی تعاون کا عطیہ ہے۔ انسانی ذہن کتنا ہی ترقی کر جائے یہ قدریں اپنی جگہ اٹل ہیں۔ ایمانداری، ایثار، پاکیزگی، ہمدردی، سچائی بہادری وغیرہ شریفانہ خصائل ہیں جن کے بغیر انسانیت کا کوئی ہیولا کسی

دور میں متصور نہیں‘‘۔ (13)

اقبال کا افکار و شعور اور پیغام کا آ ماخذ کے بارے اقبال کی شخصیت پر اثرات مرتب کرنے والے شخصیتوں کے تعلق سے لکھتے ہیں:

’’وہ جدید و قدیم، مشرق و مغرب، ہر زمانہ و مقام سے لکیریں اکٹھا کی ہیں، انہوں نے رومی کے معارف سے استفادہ کیا ہے اور نطشے کے افکار کو بھی پرکھا ہے، جمال الدین افغانی کے خیالات کا بھی متاثر ہوئے ہیں اور مارکس کے نظریات کی بھی تنقید کی ہے ....اقبال نے بلا امتیاز رومی و نطشہ اور افغانی و مارکس کے رنگ برنگ پیوندوں کو لے کر ہمارے تفنّنِ طبع کے لئے ایک جرسی تیار کر دی ہے . بلکہ درحقیقت انہوں نے بڑی دیدہ ریز، تراش و خراش کے بعد ایک ایسی کامل قبا تیار کی ہے‘‘۔(14)

پروفیسر عبدالمغنی نے جو اعداد و شمار اکٹھا کئے ہیں ان کے مطابق کم و بیش سوا سو اشخاص کا ذکر کلامِ اقبال میں ملتا ہے اور میرے خیال میں دنیا کے کسی شاعر نے اتنی بڑی تعداد میں شخصیتوں سے کام نہیں لیا ہے . ان کی تقسیم کرتے ہوئے پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

’’کلامِ اقبال کی کلیدی شخصیتیں دو قسم کے ہیں اور یہ تقسیم خود اقبال ہی کی کی ہوئی ہے، ایک تو مغرب کے حکیمانِ فرنگ، دوسرے مشرق کے اصحابِ نظر. اول الذکر نے ان کی عقلی تعلیم میں حصہ لیا ہے اور ثانی الذکر نے تربیتِ قلب میں‘‘۔(15)

احتشام حسین کی تنقید نگاری پر بات کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

’’اپنی کٹر مارکسیت کے باوجود احتشام حسین صاحب ادب و فن کے بنیادی اصولوں سے واقف ہیں ان کے جیسے ایک ذوق و شعور کی باشعور رہنمائی سے اردو ادب اور اشترا کی تحریک دونوں کو فائدہ پہنچا ہے۔ایک طرف اردو اد باشعرا پر مؤثر قدغن رہی۔تو دوسری جانب اردو ادب خالص اشترا کی ، بے ادبی سے کچھ نہ کچھ محفوظ رہا۔ احتشام صاحب کا یہ احسان ہمیں ماننا ہوگا کہ اپنی قیادت میں

انھوں نے ہمیشہ اپنی تمام جانب داریوں کے باوجود موضوع اور اسلوب کے درمیان کے درمیان توازن کی تلقین کی اور اہل ہند اس تنقید سے مستفید ہوئے‘‘۔(16)

احتشام حسین نے خود پروفیسرعبدالغنی کا مقالہ احتشام حسین کی تنقید نگاری پر بات کرتے ہوئے یہ بیان قابل غور ہے جس سے پروفیسرعبدالغنی کے تنقیدی بصیرت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے:

’’اس میں لفاظی، طعن و طنزاور پینترے بازی نہیں ہے۔ اپنے علم اور مطالعے سے مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے بلکہ منطقی انداز میں اعتراض وارد کر کے بعض بعض مسئلوں کی وضاحت کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ لکھنے والے نے میری نیت پر شک نہیں کیا ہے۔ میرے علم میں نقص پایا ہے اور میرے عقیدے کو کوتاہیٔ ذہن پر محمول کیا ہے‘‘۔(17)

مذکورہ بیان سے یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ پروفیسرعبدالغنی اپنے موضوع کے ساتھ انصاف برتتے ہیں اور ان کے تنقیدی رویے میں توازن پائی جاتی ہے۔ احتشام حسین کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ مارکسی نظریہ ادب کے طلسم میں گرفتار ہونے کے باوجود وہ غالب و اقبال جیسے ماورائی فن کاروں کی قدر و قیمت کو بھی سمجھ سکتے ہیں اور تجزیاتی طور پر سمجھا سکتے ہیں۔ یہ بات ان کے بلند ذوقِ ادب اور پختہ شعور کی محکم دلیل ہے۔

جادہ اعتدال (1972):- پروفیسرعبدالمغنی کے تنقیدی مضامین دوسرا مجموعہ جادہ اعتدال 1972ء میں منظر عام پر آئی، اسے کتاب منزل سبزی باغ پٹنہ نے پہلی بار شائع کیا .اس میں شامل مقالات کا عنوانات درج ذیل ہیں

1۔ عظمت غالب کی حقیقی بنیاد
2۔ اقبال کی انسان دوستی
3۔ جدید ادبی مسائل
4۔ فیض کی شاعری
5۔ فراق کا تغزل

6۔ اختر اورینوی کی افسانہ نگاری

7۔ علی عباس حسینی کی افسانہ نگاری

8۔ مانوس سہسرامی کا تغزل

9۔ عبدالعزیز خالد کی شاعری کا جوہر

10۔ تلوک چند محروم

11۔ پرویز شاہدی کا شاعرانہ مقام

12۔ شین مظفر پوری کی افسانہ نگاری

13۔ ڈراما اور تھیٹر

14۔ اردو افسانے کا ایک رخ

15۔ جدید اور قدیم فریب

16۔ جدید اردو شاعری میری نظر میں

17۔ ملّا ابن العرب مکّی کی طنز نگاری

18۔ اسلامی ادب

19۔ رشید احمد صدیقی کی تنقید نگاری

20۔ کلام اقبال کی اشاریت

21۔ اردو شاعری میں انیس کا امتیاز.

جادہ اعتدال کے ابتدا میں ادب و تنقید کے تعلق سے اپنے موقف کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں

'ادب میرا پہلا عشق رہا ہے اور میں اس کو تزئین حیات کا بہت بڑا وسیلہ سمجھتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ جس معاشرے کا ادب خراب ہوجاتا ہے اس کے دل و دماغ قوبھی کسی شاعری نہیں افسانے ڈراما، ناول، اور تنقید مریضانہ ہوں اس قوم کو کسی بھی طور صحت مند نہیں سمجھا جا .یہاں تک کہ اندیشہ ہونے لگا تھا کہ اردو ادب بین الاقوامی اشتراکیت کی ایک نو آبادی ہوکر اپنی انفرادیت اور نفاست سے یکسر محروم نہ ہوجائے"۔(18)

پروفیسر عبدالمغنی چاہتے تھے کہ اردو ادب کو بے راہ روی، انتشار، اشترا کی وجدیدی، انتہا پسندی اور بے اعتدالیوں سے بچا کر ایک جادہ اعتدال قائم کیا جائے حالانکہ وہ نئی نسلوں کی باریکی وتخیّل کا قائل ہیں اور یہ بھی سمجھتے ہیں کہ مستقبل کی امیدیں انہی سے وابستہ ہیں، نئے ادب پر تنقید سے ان کا مقصد یہ ہے کہ امیدیں اور زیادہ سے زیادہ نکھر کر سامنے آئے . جیسا کہ مشہور ہے ادب زندگی کا آئینہ ہے وہ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں وہ ادب کو ادب کے جمالیات کے ساتھ ساتھ انسانی وجود و زندگی کے اصلیت وعظمت کا قدردان ہیں وہ رقمطراز ہیں:

"زندگی اور ادب دونوں کو اپنی اپنی جگہ ایک کل اور ایک دوسرے کے ساتھ مربوط سمجھ کر پارہ فن کا تجزیہ وتبصرہ اس انداز سے کرنا چاہئے کہ فن کے تمام عناصر ولوازم کی پوری تصویر اُبھرے اور ساتھ ہی ادب وزندگی کی اصلیت وعظمت کی قدریں نکھاریں اور سنواریں"۔(19)

جادۂ اعتدال میں شامل مضمون ''عظمت غالب کی حقیقی بنیاد'' میں پروفیسر عبدالمغنی نے غالب کے کلام کا مطالعہ اور ساتھ ہی ساتھ ان کے خطوط کا مطالعہ بھی تاریخی پس منظر کے نیز غالب کے ذہنی میلانات اور انداز فکر کی روشنی میں بڑے ہی سلجھے ہوئے متوازن انداز میں کیا ہے . غالب کے سلسلے میں یہ کہہ کر اپنے قارئین کو چونکا دیتے ہیں کہ ''نظریات وافکار کے معاملے میں غالب کا مقام مقلد کا ہے نہ کہ مجتہد کا'' عام طور پر غالب کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے دور کے انقلابی تھے لیکن یہاں معاملہ برعکس ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی کہتے ہیں کہ ان کی ساری آزادگی وخود بینی بس ایک شاعرانہ تخیل تک محدو تھی بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ تخیل کے رو میں اگر کبھی انہوں نے اپنی معاشرے کے بنیادی سے بہ ظاہر ٹکرانے والی بات کہی بھی تو پھر اس موضوع پر دوسرے لمحوں میں کہے ہوئے ان کے دوسرے اشعار اس بات کا حقیقی مفہوم متعین کرتے نظر آتے ہیں، جس کے متعلق حوالے کے طور پر پروفیسر عبدالمغنی نے غالب کے چار اشعار پیش کرتے ہیں ۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ستائش گر ہے زاہد اس قدر باغ رضواں کا
وہ ایک گلدستہ ہے ہم بخوروں کے طاق نسیاں کا

طاعت میں تار ہے نہ مئے ورنگیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تیری جلوہ گاہ ہو

لیکن تضاد یہ ہے کہ غالب اس طرح کا شعر بھی کہتے ہیں۔

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

جس میں غالب کا انداز ندامت کا ہے اور تیور بغاوت کی بجائے اطاعت ہے۔ پہلے باب میں ہی بتایا گیا ہے کہ پروفیسر عبدالمغنی ذہنی وفکری اعتبار سے اقبال کے بہت قریب ہیں اور انہیں اسلام پسندی پر فخر ہے، شاید اسی لئے انہوں نے اقبال پر مختلف عناوین سے سب سے زیادہ لکھا . جادہ اعتدال میں بھی اقبال پر دو مضامین "اقبال کی انسان دوستی" اور " کلام اقبال کی اشاریت" ہے . دونوں مضمون میں انہوں نے اقبال کی شاعرانہ عظمت کے بیان میں توازن برتنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور ان کی انسان دوستی نیز کلام کی اشاریت کے نمایاں پہلو کو اجاگر کرنے کی عمدہ کوشش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ''اقبال نہ صرف یہ کہ صاحبِ پیغام شاعر ہیں بلکہ وہ ایک الہامی شاعر بھی ہیں یعنی ان کا فلسفہ محض کتاب خوانی اور ذہنی ریاضت کا ثمرہ نہیں بلکہ اس کے پیچھے قوت محرکہ ایک الوہی جذبہ ہے . اقبال نے اپنے وقت کے فلسفہ پر جو تنقید کی ہے اور ان فلسفوں پر متغائر اور متبادل جو ایک نظام فکر پیش کیا ہے وہ اسی

الہامی موقف سے ہے .انہوں نے اسلام کوشعوری طور پر انسان اور کائنات کے درمیانی ارتباط کا سب سے فطری اور معقول اور مکمل طریقہ سمجھا ہے .ان کے نزدیک جدید انسانی علم و عقل کی فراوانی کے باوجود اس درجہ پریشان اور زار و نزار ہے .اس کا سبب یہی ہے کہ وہ اسلام کے اصول فطرت اور طریق حکمت سے دور ہٹ گیا ہے"۔(20)

درج بالا اقتباس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر عبدالمغنی نے کلامِ اقبال کی گہرائی سے مطالعہ کر کے تجزیہ کیا ہے۔عبدالمغنی کے تنقید میں ادب کی خارجی ہیئت اور فنّی لوازمات سے زیادہ ادب میں پیش کردہ ان اخلاقی قدروں کے مقابلے میں احساس جمال کو قطعی اہمیت نہیں دیتے .جادہ اعتدال اس بات کی مثالیں نمایاں ہیں . ویسے تو فراق گورکھپوری کے بعض فنّی عیوب و نقائص کی طرف بھی انہوں نے توجہ دلائی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ فراق کا تغزل ان کے اخلاقی معیار سے ہم آہنگ نہیں ہے اور اسی لیئے وہ ان کے معیار تنقید پر کھڑا نہیں اترتا . لکھتے ہیں:

''اردو غزل گوئی کی روایت میں فراق نے بلاشبہ ایک اضافہ کیا ہے اور وہ اپنا منفرد و ممتاز احساس و آواز کے مالک ہیں . لیکن یہ احساس و آواز وہ نہیں ہے جو ان کی جنسی جھنجھلاہٹوں میں نظر آتی ہے .ان کا اصل اضافہ وہ ہے جس میں وہ تھوڑی دیر کے لئے متین ہو کر اپنے جذبے کی گہرائیوں اور اس کی کائناتی وسعتوں کا پتہ دیتے ہیں اور جہاں ان کی ذات منزہ ہو کر ایک آفاقی عشق کی پر درد اور حسرت انگیز آہٹوں میں ڈوب جاتی ہے۔درج ذیل اشعار فراق کے اس رنگ و آہنگ کی عکاس ہیں۔

ہزار زمانہ ادھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی کچھ تیری رہ گزر بھی

نگاہ ناز نے پردے اٹھائے ہیں کیا کیا
حجاب اہل محبت کو آئے ہیں کیا کیا

جہاں بھی تھی بس اک افواہ تیرے جلووں کی
چراغ دیر و حرم جھلملائے ہیں کیا کیا

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکر رہ گئیں

منزلیں گرد کی مانند اڑی جاتی ہیں
وہی انداز جہان گزراں ہے کہ جو تھا

شام غم کچھ اس نگاہ ناز کی باتیں کرو
بیخودی بڑھتی چلی ہے راز کی باتیں کرو

ہر رگ دل وجد میں آتی رہے دکھتی رہے
یوں ہی اس کے جاو بے جاناز کی باتیں کرو

میرے سامنے اس قسم کے اشعار فراق کے تغزل کی بلند ترین پروازیں ہیں اوران سے مختلف جو کچھ ہے وہ ان کی پست ترین گراوٹ ہے، کہنا چاہئے " بلندش بہ غایت بلند و پستیش بہ غایت پست . فراق کے "غایت بلند" اشعار اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے اوران کی "غایت پست" چیزیں اپنی موت آپ مرجائیں گے''۔(21)

تشکیل جدید(1976):- تشکیل جدید پروفیسر عبدالمغنی کا تیسرا تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔جس کی اشاعت 1976ء میں ہوئی۔اسے ڈی آرٹ پریس سلطان گنج پٹنہ نے پہلی بار شائع کیا۔اس کتاب کے مقالے ہندو پاک کے مختلف ادبی رسالوں ''نقوش'' لاہور''اردو ادب'' علی گڑھ سے''کتاب'' لکھنو میں''ادبی قدروں کی تشکیل جدید'' کے عنوان سے قسط وار شائع ہو چکا تھا۔اس مجموعے میں کل گیارہ مضامین شامل ہیں۔مضامین کے

عنوانات درج ذیل ہیں:

1۔عالمی ادب میں اقبال کا مقام

2۔اقبال اور اسلامی فکر کی تشکیل جدید

3۔جوشؔ کی شاعری کی اہمیت

4۔آل احمد سرور کی تنقید نگاری

5۔احتشام حسین اور عملی تنقید

6۔اردو شاعری میں انیس کا مقام

7۔ادب کی پہچان

8۔فکر وفن

9۔جدت وقدامت

10۔ادبی تشکیل جدید کے اسباب وعوامل

11۔شاعری کی تشکیل جدید

پروفیسر عبدالمغنی کا دستاویزی مقالہ ادبی قدروں کی تشکیل جدید ایک اہم ادبی کارنامہ ہے۔ یہ مسلسل مقالہ پیش نظر کتاب میں 136 صفحات پر مشتمل مختلف عنوانات میں مثلاً ''ادب کی پہچان''، ''فکر وفن''، جدت وقدامت، ادبی تشکیل جدید کے اسباب وعوامل، شاعری کی تشکیل جدید، میں پھیلا ہوا ہے۔ متذکرہ دستاویزی مقالہ کے ذریعے مختلف سوالات مثلاً ادب کیا ہے؟ اس کے حدود اور صفات کیا ہیں۔ اقبال کو اس موضوع سے کہاں تک دلچسپی تھی۔ نئی شاعری کے مطالبات کیا ہیں۔ جدت وقدامت سے کیا مراد ہے۔ ادبی تشکیل کی بنیادی ضروریات کیا ہے۔ اقبال کو اس موضوع سے کہاں تک دلچسپی تھی۔ نئی شاعری کے مطالبات کیا ہیں اور اس کا تجزیہ کس طرح ہوسکتا ہے؟ پروفیسر عبدالمغنی نے مدلل گفتگو کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ادبی قدروں کی تشکیل جدید کس طرح کی جاسکتی ہے۔

جدت وقدامت کے سلسلے میں مختلف رویے مثلاً ''روشن خیالی بہ مقابلہ تاریک خیالی، کوتاہ اندیشی بہ مقابلہ دور اندیشی، پیش قدمی بہ مقابلہ پس ماندگی، اجتہاد بہ مقابلہ رسمیت، روایت بہ مقابلہ بغاوت وغیرہ کی بحثیں آخر کار

نئے اور پرانے کے مقابلے پر رک جاتی ہیں۔ جدت وقدامت کی تصور جامد نہیں بلکہ آج کی ہر نئی تخلیقی رومان وترقی کے باوجود کل کلاسیکی ہو جاتی ہے اور اپنی انفرادیت ومعنویت روایت کے دائرے میں بن پاتی ہیں۔ اس لیے زمانے کا تصورروایت واقدار کی شکل میں بروئے عمل آتا ہے۔ روایت وانفرادیت کے اشتراک سے ایک نئی اور توانا روایت ظہور میں آتی ہے جس کو ''ثقافت'' سے تعبیر کرتے ہیں اور اقدار حیات، روایت وثقافت کے اندر ہی پروان چڑھتی ہیں۔ اقدار حیات کو اخلاقیات سے گہرا تعلق ہے اور اخلاقیات کے خانے میں مروت، شجاعت، سخاوت، ایثار، عمل، ایمانداری، مساوات، رواداری، حیا، اخوت، وغیرت، حرمت وشرافت، ہمدردی وغم خواری، مساوات وغیرہ جیسے جوہر ہوتے ہیں۔ اس طرح کسی ادب کا ارتقا بغیر اجتہاد واستحکام کے ممکن نہیں۔ یہ اس وقت ہوگا جب ادب کے اندر عمدگی نفاست، اعلیٰ متانت، جمال وزیبائی، لطافت وفصاحت، بلاغت ونورانیت کے عناصر موجود ہوں گے۔

لہٰذا عبدالمغنی معیاری ادب کے لیے یہ فیصلہ فرماتے ہیں:

> ''۔۔۔ ادب سب انفرادیت رومانیت اور روایت وکلاسیکت وعضویاتی ارتباط ہونا چاہیے تاکہ ایک تازہ اخلاق ذہن میں فکر وخیال کے جو پیکر ابھریں وہ پیدا ہونے سے پہلے ہی نہ مر جائیں بلکہ ایک متناسب ومتوازن اسلوب مناسب وموزوں نقوش وعلائم کے ساتھ توانا شکل میں بروئے اظہار آئیں''۔(22)

پروفیسر عبدالمغنی میں زبردست تنقیدی صلاحیت موجود ہے۔ بالعموم تنقید میں وہ غلط بیانی سے کام نہیں لیتے بلکہ حقائق کی روشنی میں ان کا تجزیاتی عمل ہوتا ہے وہ کوئی بات بغیر دلیل وثبوت کے نہیں کہتے مغربی نقادوں، ادیبوں، مفکروں کے حوالے سے بحث کرتے ہیں۔ پھر منطق کی روشنی میں وہ اپنا کوئی فیصلا صادر کرتے ہیں۔ جو فیصلہ ان کا صرف اپنا ہوتا ہے۔ یہاں پر مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ پروفیسر عبدالمغنی کبھی کبھی اپنی جذباتیت کو راہ دیتے ہوئے تنقیدی توازن کو برقرار نہیں رکھ پاتے۔ چناں چہ انھوں نے اس رو میں ترقی پسندی اور جدیدیت کو ایک ہی خانے میں رکھ کر اسلامی نقطۂ نظر سے پرکھا ہے اور اقبال کی فنکارانہ صلاحیت کے پیش نظر ادبی قدروں کی تشکیل جدید کے لیے اقبال کے نمونے کو معیار بنانے کی بات انھوں نے کہی ہے اقبال کی شاعرانہ عظمت کو دیکھتے ہوئے ان کی بات قابل غور ہے۔ ''تشکیل جدید'' میں ایک مضمون ''جوشؔ کی شاعری'' ہے۔ مذکورہ مضمون میں پروفیسر عبدالمغنی

نے جوشؔ کی شاعری کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔مضمون کے ابتدا میں موصوف نے اکبرالہ آبادی،عبدالحلیم شرراورلطیف الدین احمد کے اقوال نقل کیے ہیں جو جوشؔ اوراقبالؔ کو یکجا دیکھنے کے متمنی تھےاوران کی شاعری کواعلیٰ درجہ کی شاعری قرار دیتے ہیں۔ مذکورہ لوگوں کی آراءکوموصوف تاریخی حیثیت قرار دیتے ہیں اور ناقدین ادب کو یہ احساس دلاتے ہیں کہ اب وقت آ گیا ہے کہ جوش کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا جائے۔

بہرکیف! پروفیسرعبدالمغنی نے جوشؔ کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے انہیں شراب، شباب اورفطرت کا شاعر قرار دیا ہےاور جوشؔ کواردوشاعری کاایک ناتراشیدہ کوہ نور کہا ہے۔مضمون کے آخر میں پروفیسرعبدالمغنی نے جوشؔ کی شاعری سے متعلق جورائے قائم کی ہے۔وہ قابل مطالعہ ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''جوش موجودہ دور کے سب سے اہم شاعر ہیں۔اوران کے معاصرین میں فیضؔ، حفیظؔ، جگرؔ، فراقؔ، روشؔ، پرویز شاہدیؔ، اخترؔ، شیرانی، جمیل مظہریؔ، مجازؔ، احسان دانشؔ، یگانہؔ، جذبیؔ حتیٰ کہ حسرتؔ، فانیؔ اوراصغرؔ سبھی کا مقام ان سے ایک قدم پیچھے ہے۔ بعد کی اردوشاعری پر اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں جوش کا اثر زیادہ ہمہ گیر ہے۔ترقی پسندتحریک کی شاعری میں رومان اورانقلاب کا جومیل نظر آتا ہے وہ زیادہ تر جوشؔ ہی کے زیراثر پیدا ہوا ہے۔موجودہ زمانے کے ایک نہایت ذی استعداد شاعر عبدالعزیز خالد نے تو گویا جوشؔ ہی کے قدم پر قدم مارنے کی کوشش کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ جوشؔ کی غنائیہ اور بیانیہ شاعری کے تجربات وکمالات تاریخ ادب میں ہمیشہ محفوظ رہیں گےاورنئی نسلیں ان سے اثر لیتی رہیں گی، جب کہ انقلاب کی گھن گرج ایک قصہ پارینہ بن کر جادوگھر کی زینت بن جائے گی، بلکہ شاید بن چکی ہے۔جدید نظموں کی ہیئت میں گرچہ جوشؔ نے کوئی اضافہ نہیں کیا ہے بلکہ جس معیار تک اقبال نے اسے پہنچا دیا تھا اس کو بھی برقرار نہیں رکھ سکے،لیکن جس یکسوئی وسعت اورتنوع کے ساتھ جوشؔ نے اس ہیئت کو برتا ہےاس سے بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ آزاد، حالیؔ، اکبرؔاوراقبالؔ کی روایتی نظم کواردوشاعری میں رسوخ اورمقبولیت حاصل ہوگئی، یہاں تک کہ آج غزل کے مقابلے میں نظم کا مطلب یہی جدید ہیئت نظم ہے۔اس واقعہ سے معریٰ

اور آزاد نظموں کے مقابلے میں پابند نظم کے امکانات اور فتوحات کا بھی اندازہ
ہوتا ہے۔جدید نظم نگاری کی تاریخ میں جوشؔ کا کارنامہ نا قابل فراموش، اہم، موثر
ہے(23)

''تشکیل جدید'' کا ایک اہم مضمون ''آل احمد سرور کی تنقید نگاری'' میں پروفیسر عبدالمغنی نے آل احمد سرور کی تنقیدی کتابیں مثلاً تنقیدی اشارے، تنقید کیا ہے، نئے پرانے چراغ، ادب اور نظریہ، نظر اور نظریے اور مسرت سے بصیرت تک کے مضامین کا جائزہ لیا ہے۔آل احمد سرور کے درج ذیل خیالات ہیں:

''اردو ادب میں تنقید اب بیدار اور دور بین ہو رہی ہے۔اس نے اپنی اہمیت
کو منوالیا ہے۔اس نے ادب اور ادیبوں سے جو مقابلے کیے ہیں ان کو پیدا
کرنے کی سعی شروع ہوگئی ہے۔۔۔۔۔تنقید نے ادب میں خارجیت پیدا کی
اور شاعری نے جو جذباتی طوفان اٹھائے تھے ان کی قوت کو زندگی کے قافلے کے
لیے اسیر کرلیا ہے فضا ایک بڑے نقاد کے لیے سازگار ہے''۔(24)

اس کے متعلق پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں کہ:

''فضا اس قدر ساگار ہونے کے باوجود ایک بڑا نقاد نمودار ہوا یا نہیں جس کی
توقع آل احمد سرور نے قائم کی تھی۔ جہاں تک اردو ادب میں بڑے نقادوں کے
نمودار ہونے کا تعلق ہے اردو میں کئی ایسے تنقید نگار پیدار ہو چکے ہیں جو اس
زمرے میں آتے ہیں۔مثلاً ایک تو خود آل احمد سرور، ان کے علاوہ کلیم الدین
احمد، احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری، اختر اورینوی اور وقار عظیم۔لیکن بات
چھوٹے بڑوں کی نہیں۔ایک بڑے کی ہے یعنی کلیم الدین احمد کے لفظوں میں
اردو تنقید کی مسیحائی کی''۔(25)

اس کے بعد پروفیسر عبدالمغنی نے آل احمد سرور کی تنقید نگاری کا جائزہ لیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:

''آل احمد سرور نے اختر اورینوی کی رفاقت میں، اردو تنقید میں ایسے اہم
افکار و تصورات کو عام کیا ہے جو ہمارے جدید ادب کے ارتقا میں ایک تعمیری رول
ادا کر چکے ہیں اور جن کے اثرات بھی ادبی رجحانات کو صحیح رخ پر بڑھا سکتے

ہیں۔۔۔سرور نے جدیدیت کی سرپرستی جن مقاصد کے تحت کی ہے وہ موصوف کے بعض تصورات کی انتہاپسندی اور بےاعتدالی کے باوجود بالآخر جدید تجربوں کو ایک نتیجہ خیز راستے پر لگانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔سرؔور نے تنقید کا فریضہ ادب میں قدروں کی اشاعت قرار دے کر اور اپنے ادب کی اصلی روایات کی بنیادی اہمیت کو اجاگر کر کے اردو تنقید کو صحیح سمت میں آگے بڑھایا ہے۔۔۔ یہ صحیح ہے کہ سرؔور نے صرف مضامین و مقالات لکھے۔مستقل تصنیفات اور کتابیں نہیں ترتیب دی ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ سرور کا اسلوب تحریر شگفتہ ہونے کے باوجود محکم نہیں ہے اور ان کے تجزیوں میں انتشار پایا جاتا ہے۔۔۔لیکن سرؔور نے انگیریزی کے ٹی۔ایس ایلیٹ کی طرح اپنے مضامین و مقالات ہی سے وہ کام کر ڈالا جو دوسرے لوگ کتابیں اور تصنیفیں مرتب کر کے نہیں کر پاتے ہیں۔ کسی بھی کام میں اصل اہمیت مقدار کی نہیں معیار کی ہے، جو سرؔور نے نہ صرف اپنی تنقید میں پیش کیا ہے بلکہ اردو ادب میں قائم کیا ہے۔۔۔۔سرؔور بھی اپنے دوسرے ہم عصروں کی طرح مشرقی ادبیات کو مغربی ادبیات کے معیار سے ناپنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔اس کے بجائے کہ مشرق و مغرب کو اصولاً برابر کی سطح پر رکھ کر، بالکل اوصاف کی بنیاد پر ایک حقیقی عالمی معیار متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لہٰذا ایک بڑے نقاد کا منصب حاصل کرنے میں اپنے دوسرے تمام معاصرین کے ساتھ، آل احمد سرؔور بھی ناکام ہو گئے۔ یہ ضرور ہے کہ اس بڑے نقاد کے نمودار ہونے کے لیے سرؔور کی تنقیدوں نے فضا کچھ اور اپنے تمام معاصرین سے بڑھ کر سازگار بنا دی۔ چنانچہ ''ایک بڑے نقاد'' سے قطع نظر، اردو تنقید میں جو چند بڑے نقاد اب تک بیدار ہو چکے ہیں، ان میں آل احمد سرؔور سب سے قابل، سب سے بااثر اور سب سے بہتر ہیں''۔(26)

معیار اقدار(1981):- 1981 میں حکمت پبلی کیشنز پٹنہ نے پروفیسر عبدالمغنی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ معیار و اقدار شائع کیا۔اس مجموعے میں کل پندرہ مضامین درج ذیل عنوانات کے تحت شامل کیے گئے ہیں۔

(1) فن اور ناقد

(2) اقبال اور نئی دنیا

(3) افسانے میں ہیئتی تجربے

(4) عابد حسین ایک مفکر

(5) آغا حشر اور شیکسپیئر ایک تنقیدی موازنہ

(6) جدید اردو شاعری میں فیض کا مقام

(7) یوسف حسین خان عالم یا ناقد

(8) غزل، مہذب ترین صنف شاعری

(9) ادب میں ظرافت کی اہمیت اور اس کے عناصر

(10) ہم عصر افسانوں میں اقدار کی اہمیت

(11) اختر اورینوی بہ حیثیت نقاد

(12) پروفیسر محمد محسن کی نفسیاتی تنقید نگاری

(13) خلیل الرحمٰن اعظمی کی ادبی حیثیت

(14) غیاث احمد گدی کی افسانہ نگاری

(15) نثری نظم اور آزاد غزل۔

اس سے پہلے کہ مذکورہ مجموعے کے اہم مضامین کا جائزہ لیا جائے مناسب ہوگا کہ پروفیسر عبدالمغنی کے نظریہ تنقید پر روشنی ڈالی جائے۔ پیش نظر مجموعے میں ''میرا نظریہ تنقید'' کے عنوان سے انھوں نے صاف لفظوں میں اپنے نظریۂ تنقید کی وضاحت یوں کی ہے۔

> ''۔۔۔ میں نے اردو اور انگریزی مقالات میں بارہا اس خیال کا اظہار کیا کہ ادب کی حقیقت تو یقیناً اصناف ادب کی متعلقہ ہیئتوں کے لوازم وعناصر ہی کے پیش نظر متعین کی جائے گی۔ لیکن ادب کی عظمت لازماً کسی اخلاقی معیار سے دریافت کی جائے گی اور اس معیار کی تشکیل ایک دینی نقطہ ؟ نظر سے کی ہوگی۔

اس لیے کہ دین ہی بہ یک وقت اخلاقیات و جمالیات دونوں کا بہترین اور ایک دوسرے سے ہم آہنگ تصور پیش کرتا ہے اور صحیح معنی میں یہی تصور آفاقی بھی ہے اور ابدی بھی۔ جب کہ دوسرے تمام تصورات خواہ وہ سائنس اور صنعت کے ہوں یا معیشت اور سیاست کے، یا نفسیات اور عمرانیات کے، سب کے سب زندگی، انسان، فن اور ادب کا ناقص محدود اور ناپائدار تصور پیش کرتے ہیں۔ یہ سب غیر دینی تصورات زیادہ سے زیادہ نیم صداقتوں کے آئینہ دار ہیں۔'' (27)

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ پروفیسر عبدالمغنی کی ذہنی تربیت اور ان کی شخصیت کی نشو نما کچھ اس ماحول میں ہوئی کہ وہ اسلام کو اولیت اور فوقیت دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ادبی نقطۂ نظر بھی اسلامی رنگ کا حامل ہے۔ ان کے تنقیدی موقف سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اتنی بات تو تسلیم کرنی پڑے گی کہ ان کے پاس ایک واضح مطمح نظر موجود ہے۔ اور وہ مضامین لکھتے وقت یہ شعوری کوشش کرتے ہیں کہ ان کے نظریے کی مکمل ترجمانی ہو سکے۔

مذکورہ مجموعہ میں شامل ''فن اور ناقد'' ایک ایسا مضمون ہے جس میں پروفیسر عبدالمغنی نے ان مسائل پر تفصیلی اظہار خیال کیا ہے کہ فن اور ناقد کا باہمی رشتہ کیا ہے؟ فنکار اور ناقد میں فرق کیا ہے؟ فن (تخلیق) اور تنقید دونوں کی اہمیت و افادیت کیا ہے؟ ''افسانے میں ہیئتی تجربے'' میں انھوں نے اس امر کی جانب توجہ مبذول کروائی ہے کہ افسانہ نگار غلط قسم کے ہیئتی تجربے سے باز آ جائیں۔ ان کے خیال سے اتفاق کیا جا سکتا ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مضمون تشنہ ہے۔ ''جدید اردو شاعری میں فیض کا مقام'' ایک طویل مضمون ہے اور فیض کی شاعری کی تقریباً تمام خصوصیات کا احاطہ کرتا ہے۔ غزل مہذب ترین صنف شاعری میں اردو کے بت شکن نقاد پروفیسر کلیم الدین کے قول ''غزل نیم وحشی صنف شاعری ہے'' کا مدلل جواب موجود ہے۔ ''ادب میں ظرافت کی اہمیت اور اس کے عناصر'' میں Satire , Irony اور Humour اور Wit جیسے انگریزی کے اصطلاحی الفاظ کے لیے لغوی اعتبار سے ان الفاظ کے صحیح اور مترادفات پیش کر کے یہ واضح کیا گیا ہے کہ ادب میں طنز و ظرافت کی قدر و قیمت کیا ہے۔

تنقید مشرق (1987):- تنقید مشرق'' عنوان سے پروفیسر عبدالمغنی کا پانچواں تنقیدی مجموعہ 1987ء میں اردو بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں پندرہ تنقیدی مضامین درج ذیل عنوانات

کے تحت شامل ہیں:

(1) جدید اردو افسانہ

(2) ظفرؔ کی شاعری پر غالب کا اثر

(3) اردو ادب میں کلیم الدین احمد کا مقام

(4) اکبرؔ الہ آبادی کا فن

(5) میرؔ کا تصور انسان

(6) جدید ادبی تنقید کے مسائل

(7) جمیل مظہریؔ کا ناز بندگی

(8) اقبال اور کارل مارکس

(9) حالیؔ بہ حیثیت نثر نگار

(10) چکبست کی نظم نگاری

(11) سہیل عظیم آبادی۔شخص اور فنکار

(12) اردو ادب میں مشرق کی بازیافت

(13) ظریفانہ ادب اور تنقید معاشرہ

(14) علامہ سید سلمان ندوی بہ حیثیت ادیب۔

مذکورہ بالا مجموعہ میں ''اردو ادب میں کلیم الدین احمد کا مقام'' ایک اہم مضمون ہے۔ یوں تو کلیم الدین احمد کی ایک معرکتہ الآرا تصنیف ''اقبال ایک مطالعہ'' کی رو میں پروفیسر عبدالمغنی نے ''عالمی ادب میں اقبال کا مقام'' لکھ کر اقبال کے تعلق سے ان پر نہ صرف بھرپور تنقید کی بلکہ ان کی شخصیت پر بھی جارحانہ وار کئے۔لیکن پیش نظر مضمون میں پروفیسر عبدالمغنی نے اردو ادب میں کلیم الدین احمد کے مقام کا تعین کیا ہے۔مضمون کے ابتدا میں کلیم الدین احمد کے استاد ہونے اور درس وتدریس کا سلسلہ شروع ہونے کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں:

''اردو شاعری پر ایک نظر'' اور ''اردو تنقید پر ایک نظر'' جیسی کتابیں منظر عام پر

آ ئیں۔ان دونوں کتابوں میں شاعری اور تنقید کے متعلق ایک انتہا پسندانہ نقطۂ
پیش کیا گیا۔ یہ نقطۂ نظر خالص مغربی تھا۔گرچہ اسے عالمی ادب کا معیار فرض کیا
گیا۔اس میں نہ صرف یہ کہہ مشرق کے ادبی تصورات سے یکسر ناواقفیت کا اظہار
کیا گیا یا ان کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا بلکہ مغرب کے بھی عام ادبی تصورات سے
بھی عجیب وغریب بے نیازی برتی گئی۔ یہاں تک کہ لیوس اور رچرڈز کے مکتبۂ
فکراور طریقہ کار کو بھی پورے طور پر ملحوظ نہ رکھا گیا''۔(28)

اس کے بعد کے پیرا گراف میں پروفیسر عبدالمغنی نے نئی شاعری کی بے راہ روی کا پول کھولنے پر کلیم الدین احمد کی تعریف کی ہے ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ

''یہ ایک صحت مند عمل جراحی تھا۔۔۔ جسے انجام دے کر فن کے بہترین
تقاضوں کی طرف اس نے رہنمائی کی''۔(29)

پروفیسر عبدالمغنی کی نگاہ میں کلیم الدین احمد اردو تنقید کے مسیحا ثابت نہیں ہوئے چوں کہ انھوں نے اپنی تنقیدی کتاب ''اردو تنقید پر ایک نظر میں'' ، ''اردو شاعری پر ایک نظر'' سے بھی زیادہ سختی کے ساتھ اردو میں تنقید کے وجود سے انکار کر دیا۔ پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

''انھوں نے تذکرے کے تبصروں کو غیر تنقیدی قرار دیا۔ حالاں کہ ان میں
متن وعبارت اور الفاظ و ہیئت کی وہی جانچ پرکھ کی گئی تھی جو کلیم الدین احمد کا
بنیادی موقف ہے۔اس لیے کہ ان کے خیال میں یہ جانچ پرکھ قدیم انداز کی ذاتی
پسند و ناپسند پر مبنی تھی اور اس کا کوئی اصولی ومعروضی معیار نہ تھا''۔(30)

اس مجموعے میں شامل سبھی مضامین کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر عبدالمغنی اپنے تنقیدی موقف پر اٹل ہیں اور ادب میں فکر وفن دونوں کو یکساں اہمیت دیتے ہیں اور وہ مغرب کے کامل امتزاج کے قائل ہیں۔اور ہر نمونہ فن کی حقیقت کا سراغ خالص فنی معیار سے لگا کر ہی اس کی قدر و قیمت کا تعین ایک فکری معیار سے کرتے ہیں اور ادب کو تہذیبی اقدار کا ترجمان سمجھتے ہیں۔

تصورات (1988):- پروفیسر عبدالمغنی کی تنقیدی کتاب ''تصورات'' 1988ء میں زیورطبع

سے آراستہ ہوئی۔ اسے لکشمی پریس دریا گنج، نئی دہلی نے شائع کیا۔تصورات انیس عناوین پر بہت جامع اور وقیق مضامین شامل ہیں۔

(1) حسرت کا تصور عشق

(2) سیماب اکبرالہ آبادی کی شاعری

(3) جمیل مظہری کی مرثیہ نگاری

(4) خواجہ احمد فاروقی کا تصور ادب

(5) حیات اللہ انصاری کے دو ناول

(6) اردو ادب اور جدید تجربات

(7)ادب میں نظریئے کی اہمیت

(8) ادب میں وابستگی کا تصور

(9) علامہ سید سلیمان ندوی بہ حیثیت تنقید نگار

(10) علامہ سید سلیمان ندوی کا ادبی کارنامہ

(11) خاکہ نگاری کیا ہے

(12) محبّ وطن اقبال، ایک مطالعہ وتجزیہ

(13) ادب کا تعمیری مقصد

(14) موجودہ دور میں کیسے ادب کی ضرورت ہے

(15) امیر خسرو کی نظم نگاری

(16) ہندو پاک اردو میں مشترکہ اقدار کے امکانات

(17) صالح ادب تہذیب وادب کی وابستگی

(18) مجروح کا تغزل

(19) آزاد اور نہرو

جمیل مظہری کی مرثیہ نگاری ''تصورات'' میں ایک اہم مضمون ہے۔اس مضمون میں مختصر ترین لفظوں میں مرثیہ اور قصیدہ کے صنف کی بات کرنے کے بعد موصوف جمیل مظہری کی مرثیہ نگاری کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''موصوف نے مرثیہ نگاری کے فن میں اردو مرثیہ کے حقیقی تصور ہی کو اپنا مطمح نظر بنایا ہے اور بہت ہی شعوری طور پر انھوں نے واقعۂ کربلا کے عظیم الشان تاریخی پس منظر کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے''۔(31)

جمیل مظہری کو مرثیوں کی ہیئت سے پروفیسر عبدالمغنی کو اتفاق نہیں وہ کہتے ہیں:

''اس کی طرف جناب جمیل مظہری نے کوئی توجہ نہیں دی۔شاید وہ اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔چناں چہ بالعموم وہ بغیر کسی ترتیب کے مختلف مراحل میں مختلف باتیں کرتے چلے جاتے ہیں،گرچہ یہ ضرور ہے کہ کسی مرحلے پر کسی ایک بات کو جب وہ لیتے ہیں تو پھر کئی بندوں تک مسلسل اسی بات کو سامنے رکھتے ہیں۔مگر اول تو مختلف باتوں کے درمیان تقدیم تاخیر کی کوئی منطقی ترتیب نہیں ہوتی۔پھر ایک ہی بات پر جو مسلسل کئی بند ہوتے ہیں ان کی باہمی ترتیب کا کافی حد تک خیال نہیں رکھا جاتا۔اس کے علاوہ بعض وقت ایک ہی بند کے شعروں اور مصرعوں کے درمیان معنوی ربط کی بھی کمی ہوتی ہے۔یہ صورت حال یقیناً منظّم او محکم فکر کے فقدان کے سبب ہے۔جناب جمیل مظہری کی شاعری صرف احساسات کی شاعری ہے اس لیے اس نوعیت محض تاثراتی ہے اور تاثرات غیر مربوط ہوتے ہیں''۔(32)

پروفیسر عبدالغنی کے نزدیک جمیل مظہری کے مرثیوں میں تمہیدی اشعار مرثیے کے خاص موضوع کے ساتھ واضح مناسبت رکھتے ہیں اور تمہید موضوع کے مابین اتنی ہم آہنگی ہوتی ہے کہ تمہید کے اشعار بالکل فطری طورپ ر موضوع کے اشعار میں پیوست ہو جاتے ہیں۔مرثیے ''عزم محکم'' کے یہ تمہیدی بند بہت خیال انگیز اور حسب موقع ہیں:

عشرت کدوں میں بادہ گساروں کی رات ہے
دنیا کے رنگ و بو میں نگاروں کی رات ہے
اور کربلا میں سجدہ گزاروں کی رات ہے
یثرب کے ڈوبتے ہوئے تاروں کی رات ہے
مہلت ملی ہے شب کی امام حجاز کی
خیموں میں جا رہے ہیں نمازی نمازکو

ہے اہتمام جشن طرب فوج شام میں
روح یزید تیرتی پھرتی ہے جام میں
مصروف ہیں عماید لشکر طعام میں
شمعیں کہ جو جلائی گئی ہیں خیام میں
قوم گم ہیں تیرگی میں قلوب سیاہ کی
لشکر پہ چھار ہی ہے سیا ہی گناہ کی

کیوں کہ نہ اوڑھے پیر فلک چادر عزہ
ہے یہ شب شہادت سلطان دوسرا
صحرا میں نصف شب سے ہے جاروب کش صبا
کیوں کر نہ ہو کہ ارض مقدس کی یہ فضا
مشہد بنے گی سبط رسالت پناہ کے
شبنم سے دھل رہی ہے زمیں قتل گاہ کی

ان اشعار میں بہت لطیف احساسات کی شاعری اور شاعر کا تخیل باریک بینی اور نکتہ سنجی کے ساتھ اس فضا کی باز آفرینی اور تصویر کشی کر رہا ہے جو معرکے سے قبل میدان کربلا پر طاری تھا۔ یقیناً اس جنگ کا موزوں پس منظر ہے جس میں وقتی طور پر اہل حق کو ہزیمت ہونے والی تھی، اگر چہ یہ شہادت حق درحقیقت باطل

کوتاریخ میں ہمیشہ کے لیے سرنگوں کر دینے والی تھی (33)

مضمون کے آخر میں پروفیسر عبدالمغنی کہتے ہیں کہ:

''اس فضا کے ذریعہ شاعر اپنے زمانے اور انسانیت کو ایک پیغام دینا چاہتا ہے''۔(34)

پروفیسر عبدالمغنی کا ایک مضمون سید سلیمان ندوی، بہ حیثیت تنقید نگار بھی قابل مطالعہ ہے۔اس مضمون میں ندوی صاحب کی تصنیف ''نقش سلیمانی'' اور ''خیام'' کی روشنی میں ان کی ناقدانہ بصیرت کا جائزہ لیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:

''ہم علامہ کو عصر حاضر کا ایک مصلح تنقید نگار کہہ سکتے ہیں اور ان کے ادبی رہنما ہونے میں کوئی سبہ ہی نہیں۔ان کی اس ادبی رہبری کی سب سے بڑی دستاویز اور اردو میں تحقیق و تنقید دونوں کا ایک سنگ میل ان کا شاہکار ''خیام'' ہے۔ادبی تحقیق کی صف میں ''خیام'' سے بہتر کوئی کتاب آج تک اردو میں نہیں لکھی گئی اور یہ تحقیقی و تنقیدی کام بہترین حسیات کے ساتھ کی گئی ہے۔اس میں ایک طرف تمام متعلقہ اعداد و شمار اور جملہ ضروری حقائق کا احاطہ ہے۔یہاں تک کہ موضوع سے متعلق دنیا کی تمام زبانون میں پیش کیے گئے تازہ ترین مواد کا جائزہ ہے۔ جب کہ دوسری طرف رباعیات خیام کی تشریح و تفہیم اعلیٰ تنقیدی انداز سے کی گئی ہے۔اور ان کی صحیح قدر و قیمت کی تعین کے لیے ایک بے خطا اور بے مثال تجزیے سے کام لیا گیا ہے''۔(35)

''علامہ سید سلیمان ندوی کا علمی کارنامہ'' کے عنوان سے ایک مضمون اور بھی ہے جس میں پروفیسر عبدالمغنی علامہ کی تصنیف ''سیرۃ النبی'' کو ان کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ قرار دیتے ہیں۔ساتھ ہی علامہ کی تصنیف ''خطبات مدارس''، ''سیرت عائشہ'' اور ''حیات شبلی'' کو بھی اعلیٰ درجہ کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔

اس طرح ''تصورات'' کے مضامین کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ پروفیسر عبدالمغنی کی تنقید کسی فنکار کے فن کو جسے وہ سات پردوں میں چھپاتا ہے انھیں کھول کر سامنے لے آتی ہے۔جس سے اقدار و تہذیب کے فروغ کی توقع کی جاسکتی ہے۔

اسلوب تنقید(1989):- 1989 میں پروفیسر عبدالمغنی کی کئی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ان میں ایک کتاب ''اسلوب تنقید'' بھی ہے جو اٹھارہ (18) تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔ڈیمائی سائز میں یہ کتاب 280 صفحات کی ہے۔اسے عاکف بک ڈپو مٹیا محل دہلی نے شائع کیا۔مضامین کے عنوانات حسب ذیل ہیں:

(1) عبدالحق کی تنقید نگاری

(2) عبدالغفور شہباز ایک معمار اردو

(3) محی الدین قادری زورؔ کی تنقید نگاری

(4) ادب میں نعت گوئی کی اہمیت

(5) ماہرالقادری کی شاعری

(6) راسخ عظیم آبادی کا تغزل

(7) مولانا ابوالکلام آزاد کی دانشوری

(8) شبلی کی تنقید نگاری

(9) اسلوبیاتی تنقید

(10) غالبؔ کا اخلاقی نقطۂ نظر

(11) غالبؔ کا تغزل

(12) مالک رام اور اسلامیات

(13) اردو میں تعلیم پانے والوں کی ملازمت کا مسئلہ

(14) تسکیل افسانہ

(15) آدھا شاعر پورا آدمی

(16) اقبال اور ٹی ایس ایلیٹ

(17) نسیم حجازی کا فن

(18) قرآن مجید کا ادبی اعجاز

مذکورہ کتاب کا پہلا مضمون ''عبدالحق کی تنقید نگاری ہے۔اس مضمون میں شبلی اور حالی کے بعد پروفیسر عبد المغنی نے عبدالحق کو ناقد تسلیم کیا ہے۔ان کے مطابق عبدالحق حالی کی اخلاقیات اور شبلی کی جمالیات کے جامع ہیں۔ پروفیسر عبدالمغنی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ عبدالحق نے کوئی تنقیدی کتاب نہیں لکھی اور نہ کوئی مستقل تنقیدی مقالہ دستیاب ہے لیکن انھوں نے جو مقدمے اور تبصرے لکھے ان میں وہ تمام باتیں ہیں جو تنقیدی مقالات اور مضامین میں پائے جاتے ہیں۔ پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

''شبلی ہی کی طرح وہ بھی ایک محقق ہیں اور ان کی تنقید کو تحقیق سے بالکل الگ کر کے دیکھنا مشکل ہے۔ درحقیقت عبدالحق کی تنقید نگاری میں ایک تحقیقی وزن ہے اور ان کی تحقیق میں ایک تنقیدی نظر ہے۔ وہ صرف ادیب نہیں، عالم بھی ہیں۔علم و ادب کا یہ امتزاج ہی انہیں بیک وقت شبلی اور حالی دونوں کا جانشیں بناتا اور اردو تنقید کی تاریخ میں ایک منفرد و ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔اس مقام کی ایک نمایاں خصوصیات مشرق و مغرب کی ہم آہنگی بھی ہے۔عبدالحق شبلی و حالی کی بہترین تنقیدی روایات کے نہ صرف وارث بلکہ ان میں کچھ توسیع کرنے والے بھی ہیں۔ یہی چیز انھیں جدید اردو تنقدی کے بانیوں اور ان کے بعد آنے والے جدید تر اردو ناقدین کے درمیان ارتقا کی ایک اہم کڑی بنا دیتی ہے۔اس سلسلے میں ان کم عمر ہم عصروں میں کوئی ان کا جانشیں نظر نہیں آتا ہے''۔(36)

اس طرح پروفیسر عبدالمغنی کی نظر میں اردو تنقید میں مولوی عبد الحق کا مقام محفوظ، مستحکم منفرد اور ممتاز ہے۔دوسرا مضمون جو اس کتاب میں مجھے اپنی طرف کھینچتا ہے وہ ہے ''محی الدین قادری زورؔ کی تنقید نگاری''۔اس مضمون کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ پروفیسر عبدالمغنی کے نزدیک عبدالحق اور رشید احمد صدیقی کے بعد جدید اردو تنقید کا جو دور شروع ہوتا ہے اس کی پہلی معتبر آواز محی الدین قادری زورؔ کی ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

''وہ پہلے اردو ناقد ہیں جنھوں نے مغرب کے تنقیدی تصورات سے براہ راست استفادہ کر کے ایک عالمی تنقیدی معیار کے مطابق متعدد اور معتمد بہ ادبی مطالعات کیے۔ اس سلسلے میں ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے جدید اصول تنقید پر اس وقت بحث کی جب ماہیئت اور حدود تک کا تعین نہیں ہوا

تھا اور بالعموم اس موضوع پر ابہام یا انتشار پایا جاتا تھا۔ تنقیدی نظریات یا نظریاتی تنقید پر محی الدین قادری زورؔ کی یہ بحث یقیناً ایک ابتدائی کوشش ہے، مگر یہی اس کی تاریخی اہمیت بھی ہے۔۔۔۔اصول تنقید پر زورؔ کی کتاب ''روح تنقید'' ایک معرکۃ الآرا کارنامہ ہے۔ اس کے مختلف ابواب دنیائے ادب میں تنقید کے ارتقا کا ایک ایسا مرقع پیش کرتے ہیں جو معلومات سے لبریز ہے۔ اس میں مغربی ادبیات کے ساتھ ساتھ عربی ادب سے بھی اعتنا کیا گیا ہے۔ اس کی یہ خصوصیت ایک خوبی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے دور کے بہتر ے جدید ناقدوں کے برخلاف زورؔ کی نگاہ میں اپنے مشرقی ورثے کی بھی کم اہمیت نہیں تھی''۔ (37).

مذکورہ مضمون میں پروفیسر عبدالمغنی نے زورؔ کی دلچسپی صوتیات اور لسانیات سے تھی اس کا بھی ذکر کیا ہے اور کہا ہے:

''یہ صوتیات اور لسانیات سے شغف اور ان میں (ویژن) بصیرت ہی کا نتیجہ ہے کہ زورؔ نے اردو کے اسالیب بیان پر ایک کتاب 1927ء میں لکھی'' (38)

مضمون میں پروفیسر عبدالمغنی نے زورؔ کی دیگر کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے اور آخر میں انھوں نے بڑے منصفانہ انداز میں زورؔ کے لسانیات وصوتیات اور اسلوبیات کے کارنامے کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''زورؔ نے تنقید نگاری کے جن اصولوں سے بحث کی ہے ان کا اطلاق بھی انھوں نے متعدد ادبی موضوعات پر کیا ہے۔ وہ نظریاتی تنقید کے مباحث کے ساتھ ساتھ عملی تنقید کے نمونے بھی پیش کرتے ہیں۔ اس جامعیت کے ساتھ تنقید نگاری انھوں نے جدید اردو تنقید کے تشکیلی دور میں کی۔ لہٰذا ان کا شمار تنقید جدید کے معماروں میں ہونا چاہئے۔ اس سلسلے میں ان کی کاوشیں ایک پیش رو اور پیشوا کی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ لسانیات وصوتیات کے تناظر میں زورؔ نے اسلوبیات کا جو کام کیا ہے وہ انھیں آج کے ایک مکتب تنقید کا بانی قرار دینے کے لیے کافی ہے''۔(39)

''شبلی کی تنقید نگاری'' پروفیسر عبدالمغنی کا پُر مغز مقالہ ہے۔اس مضمون کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ پروفیسر عبدالمغنی کس درجہ مشرقیت کے قائل ہیں۔پروفیسر عبدالمغنی مشرقی ادب کو مغربی ادب سے کم نہیں سمجھتے اور اسے منوانے کے لیے وہ انتہا تک پہنچ جاتے ہیں۔شبلی کی ''موازنہ'' سے بھر پور بحث کی ہے انیس کے مراثی میں منظر نگاری واقعہ نگاری، جذبات نگاری اور رزمیہ نگاری کی وہ مثالیں ملتی ہیں جس نے مرثیہ نگاری کا روایتی تصور ہی بدل کر رکھ دیا اور دوسروں کو اس صنف کا پتہ دیا۔

مضمون میں مولانا شبلی کی دیگر تصانیف پر بھی سیر حاصل بحث ہے۔لیکن شبلی کی سوانح نگاری کے تعلق سے کم باتیں تحریر کی گئی ہیں۔''شعر العجم'' اور ''موازنہ انیس و دبیر'' پروفیسر عبدالمغنی کے نزدیک شبلی کا اعلیٰ کارنامہ ہے۔مذکورہ مضمون میں بھی پروفیسر عبدالمغنی نے کلیم الدین احمد کو شبلی کے تعلق سے نشانہ بنایا ہے۔غرض کہ پروفیسر عبدالمغنی کے نزدیک علامہ شبلی کی ادبی شخصیت میں ایک کامل نقاد کی تمام خصوصیات موجود ہیں جس سے انکار کی گنجائش کم ہے۔مذکورہ کتاب کے مضامین کے مطالعہ سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مضمون نگار نے ہر مضمون میں اپنا تنقیدی موقف سامنے رکھا ہے اور ادب کے جمالیات کے ساتھ ساتھ اخلاقیات پر بھی پورا زور دیا ہے تا کہ ایک فن لطیف تہذیبی افادیت کا سراغ اہل نظر کا مل جائے اور معلوم ہو کہ فنکار نے انسانیت کی کوئی وقیع خدمت انجام دی ہے۔

تنویر اقبال (1990):- اسے سب سے پہلے پاکستان سے زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور نے 1990ء میں شائع کیا۔اس میں تمام مضامین اقبال کے تعلق سے ہی ہیں۔اس کتاب میں مختلف عنوانات کے تحت اقبال کے الگ الگ پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔دراصل اسے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ماہر اقبالیات نے اقبال پر پرفیسر عبدالمغنی کے مضامین جو مختلف مجموعوں اور رسالوں میں شائع ہو چکے تھے کو یکجا کر کے ایک مستقل مجموعے میں مرتب کر دیا ہے۔اس مجموعے میں شامل عناوین درج ذیل ہیں۔

(1) اقبال کی حقیقت وعظمت

(2) عالمی ادب میں اقبال کا مقام

(3) اقبال اور نئی دنیا

(4) اقبال کا فن

(5)اقبال اور اسلامی فکر کی تشکیل جدید

(6) کلام اقبال کی اشاریت

(7)اقبال کی انسان دوستی

(8)اقبال اور شخصیتیں

(9)اقبال اور دہریت

(10)اقبال کی فارسی شاعری

(11) موازنہ اقبال و غالب

(12) اقبال اور کارل مارکس

(13)اقبال اور ٹی۔ایس۔ایلیٹ

(14)اقبال کی شاعری میں حضرت حسین کا مقام

تنویر اقبال میں شامل مضامین ''عالمی ادب میں اقبال کا مقام، اقبال کا فن، اقبال اور اسلامی فکر کی تشکیل جدید'' کے عنوان سے پرفیسر عبدالمغنی کا مستقل تصانیف شائع ہو چکا ہے جس میں اقبال کے تعلق سے تفصیلی گفتگو کیا گیا ہے۔

مطالعہ اقبال یعنی اقبال کے فکر وفن کا مطالعہ پچھلی نصف صدی میں اس کثرت سے کیا گیا ہے جس سے لگتا ہے کہ اب اقبال کا کئی بھی پہلو باقی نہیں رہ گیا ہے۔اس کے باوجود پرفیسر عبدالمغنی تنویر اقبال کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اقبالیات کا کوئی گوشہ تاریکی میں نہیں رہ گیا ہے۔
لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقبال علم وفن کے جس سمندر کا نام ہے ابھی اس کی تہہ سے
جتنے موتی نکالے گئے ہیں تقریباً اتنے ہی اور تہہ میں پڑے ہوئے ہیں۔''
(40)

تنویر اقبال میں سب سے پہلا مضمون ''اقبال کی حقیقت وعظمت'' کے عنوان سے ہے۔جس میں اقبال کی عظمت وحقیقت کو دیگر عالمی ادیبوں کے مقابلے میں بحث میں لایا گیا ہے۔اقبال جتنے بڑے مفکر ہیں اتنے ہی

بڑے شاعر بھی، وہ اقبال کو دنیا کے بہترین شاعر قرار دیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''جس کی طرح کی شاعری اقبال نے جس پیمانے پر اور جس فنی کمال کے ساتھ کی ہے اس کا موازنہ دنیا کے کسی شاعر کے تخلیقات کے ساتھ کرنا فضول ہے۔ اس لیے کہ اتنی منظّم فکر کے ساتھ اتنی موثر شاعری نہ دانتے نے کی، نہ شیکشپیر اور گوئٹے نے۔ رومی اور حافظ نے بھی نہیں۔ اقبال ایک طرف تو پوری مشرقی وایشیائی شاعری کا نمونہ کمال اپنے کلام میں پیش کرتے ہیں اور ان کا فن عربی سنسکرت، فارسی اور اردو کی تمام شاعرانہ روایات کا بہترین مرکب اور ان میں نہایت قیمتی توسیع واضافہ ہے۔۔۔ میرا خیال ہے کہ اگر شیکسپیر کے ڈراموں سے اس کی شاعری کے تمام عناصر نیز اس کی دیگر شاعرانہ تخلیقات کو یکجا کر کے اقبال کی شاعری کے مجموعی مواد کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا جائے تو یقینی طور پر معلوم ہو جائے گا کہ شعریت کے اعتبار سے اقبال کا پلہ بھاری ہے۔ یہی بات دانتے اور گوئٹے کے ساتھ ہوگی، اگر ان کی شعریت کے مجموعی عناصر کا موازنہ اقبال کے عناصر شعریت کے ساتھ کیا جائے، اقبال کی فنی برتری واضح ہو جائے گی۔ رومی وحافظ کے مقابلے میں بھی اقبال کا سرمایۂ فن زیادہ ہے۔''(41)

تنویر اقبال کا سب سے اہم مضمون ''عالمی ادب میں اقبال کا مقام'' ہیں۔ اس مقالے سے قبل 1982ء میں اسی موضوع پر ایک مستقل تصنیف ''اقبال اور عالمی ادب'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ ایسی تصنیف کا اجمالی جائزہ ہے اس مقالے میں مصنف نے عالمی ادبیات کے تقابل کے اہم شرائط کو پیش کیا ہے اور پھر انہیں شرائط کے بنیاد پر اقبال کا موازنہ دیگر عالمی ادیبوں سے کیا ہے۔ ہر تخلیق دو اجزاء کا مرکب ہے، ایک مواد اور دوسرا ہئیت، لسانی وسلیہ اظہار کی تخصیص کے سبب ہئیت ایک بالکل مقامی ومحدود عنصر ہے جبکہ مواد کے اندر عالمی وآفاقی ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اسی لئے صرف ہئیت یا مواد یعنی صرف ایک جز کو لے کر پورے مرکب پر کوئی حکم ہی نہیں لگایا جا سکتا، ترجمے سے صرف کسی تحریر یا تخلیق کا مفہوم ہی سمجھ میں آ سکتا ہے اسکی قدر و قیمت کا مناسب ادبی مقام تعین نہیں کیا جا سکتا ہے۔ پرفیسر عبدالمغنی ادبیات عالم کے تقابلی مطالعے کا تصور پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہرادبی تخلیق میں فکر وفن کا جومرکب ہواس کی مجموعی قدروں کا تعین کیا جائے۔ پھرمختلف ادبیات کی قدروں کے مجموعوں کا تقابلی مطالعہ کرکے ان کے باہمی اوصاف کی تشریح کی جائے۔ ایک زبان کا ادب پارہ اپنے عناصر ترکیبی کے جونتائج پیش کرے ان کا موازنہ دوسری زبان کے ادب پارے کے عناصر ترکیبی کے نتائج سے کرکے ایک تقابلی میزان کل نکالنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ اس طرح مختلف ادبیات کا ایک کلّی تناسب اور اس کی روشنی میں مختلف ادبی نمونوں کے مراتب کی نسبت معلوم ہوسکتی ہے۔'' (42)

عالمی ادب میں اقبال کے مقام تعین کرنے کے لیے سب سے پہلے مشرقی ادبیات میں ان کی حیثیت تعین کرتے ہوئے مشرقی زندہ زبانوں کے لافانی ولاثانی شعراء رومؔی، حافظؔ، سعدؔ اور خیامؔ سے اقبال کا موازنہ کیا ہے اور پھر اس کے بعد اردو میں میرؔ و غالبؔ، سنسکرت کے کالی داس، عربی کے امراءالقیس، بنگلہ کے ٹیگور کے شاعری کا جائزہ اقبال کے مقابلے میں پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''رومؔی کی مثنویات کا حجم جو بھی ہو اقبال کی فارسی مثنویاں (اسرار ورموز وغیرہ) اور اردو مثنوی (ساقی نامہ) ملا کر بہ اعتبار وصف رومؔی کی شاعری پر ایک دقیع اضافہ ہیں۔ فکر وفن کی مجموعی شعریت کا انداز کلام اقبال میں ہے وہ کلام رومی پر ایک قدر زائد ہے۔۔۔ حافظؔ کے دیوان کا موازنہ اگر صرف 'پیام مشرق' کے باب غزلیات 'مے باقی' سے کیا جائے معلوم ہو جائے گا کہ خود حافظؔ کی زمین پر اقبال کے تصرفات کیا کچھ ہیں۔ اس کے علاوہ 'زبور عجم' اور 'بال جبریل' کی غزلیں حافظؔ کی حدود تغزل سے بلا شبہ آگے نکلی ہوئی ہیں۔۔۔ خیامؔ کے رباعیات پیام مشرق کے حصہّ رباعیات کے ساتھ ملا کر پڑھی جائے تو عجیب غریب نکتہ دریافت ہوگا کہ اقبال کی فکر انگیزی میں خیام کی عیش کوشی سے زیادہ آب وتاب اور انبساط ونشاط ہے۔۔۔ سعدؔی کا موازنہ شعریت میں اقبال کے ساتھ کرنا کوئی بہت موزوں کام نہیں ہے۔ اقبال کا تفوق کچھ معاملے میں ظاہر ہے۔ جہاں تک دانش وری کا تعلق ہے، اقبال کے اجتماعی تصورات سعدؔی کی

شخصی اخلاقیات سے بہت ممتاز ہیں اور ان کی آفاقی اہمیت واضح تر۔ اردو شاعری میں میرؔ اور غالبؔ نے روایت ارتقا کو جہاں تک پہنچایا تھا، اقبال نے اس سے بہت آگے بڑھادیا۔ میرؔ کا فنی تجربہ تو بہت ابتدائی اور سادہ قسم کا تھا ۔غالبؔ کا تجربہ یقیناً بلوغت کی پیچیدگی رکھتا ہے لیکن اقبال نے اسی بالغانہ پیچیدگی کو درجہ کمال تک پہنچایا، غالب کے یہاں جو کچھ ناہمواریاں اور سلوٹیں رہ گئی تھیں ان کو بالکل دور کر کے نفاست بیان کا ایک انتہائی معیار قائم کیا۔ ۔۔سنسکرت کے کالی داسؔ اور عربی کے امراءالقیسؔ کا اقبال کے ساتھ موازنہ ویسا ہی ہوگا جیسے کسی تجربے کے اغاز کا تقابل اس کی ہئیت عروج کے ساتھ کیا جائے۔"(43)

اقبال کی شاعری درحقیقت مشرقی ادبیات کی تمام شاعرانہ روایات کا نقطۂ عروج ہے۔ فارسی، سنسکرت اور عربی میں شاعری کے جتنے تجربات اقبال سے قبل ہو چکے تھے۔ان سب کے بہترین احساسات ونقوش کو اپنے اندر سمیٹ اور سمو کر اقبال کے فن نے ارتقا کا ایک نیا مرحلہ طے کیا۔ جو اس وقت مشرقی شاعری کی منزل آخریں نظر آرہا تھا۔ اقبال کی شاعری نے بھی ان زبانوں کے تمام شعری وسائل کی ترکیب اور ارتکاز اپنے اندر کرلیا۔ اقبال کا فن مشرق میں اپنے پیش رووں کے کارناموں کی توسیع اور تجدید کرتا ہے۔ اقبال کی شاعری ہی مشرقی ذہن کی بہترین نمائندہ ہے اور عالمی سطح پر اس کی آفاقی اہمیت کا پس منظر یہی ہے۔ اس پس منظر میں اس کی شاعری نے وہ فکری وفنی قدریں ترتیب دی ہیں جو عالمی ادبیات میں ایک مثالی معیار پیش کرتی ہیں۔

اس کے بعد عالمی سطح پر تین شعراء، ایک اطالوی شاعر دانتےؔ، دوسرا انگریزی شاعر شیکسپیئرؔ اور تیسرا جرمن شاعر گوئٹےؔ سے موازنہ کیا ہے۔

اقبال اور شخصیتیں اس مجموعے کا ایک اور اہم ترین مقالہ ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اقبال اور شخصیتیں کے مابعین کیا رشتہ وتعلقات تھا۔ انھوں نے اپنی شاعری میں جتنے اشخاص کا ذکر کیا ہے، شاید ہی کوئی شاعر ہو جس نے اتنے اعلیٰ پیمانے پر شخصیتوں کا اپنی شاعری میں ذکر کیا ہو۔ اقبال نے بلاشبہ اپنے نظریۂ حیات یا زیادہ صیح لفظوں میں پیام زندگی کی تشکیل میں مختلف عناصر سے کام لیا ہے اور اس کے لئے انھوں نے متفرق اشخاص سے بحث کی ہے۔ جس میں شعراء

صوفی، حکماء فلسفی، شہید، فاتح وشاہ، فقیر، ادیب، عالم سبھی نظر آتے ہیں۔ اس تعلق سے پروفیسر عبدالمغنی رقمطراز ہیں:

> ''میں نے اقبال کے تمام تصنیفات سے جو اعداد وشمار اکٹھا کئے ہیں ان کے مطابق کم وبیش سوا سو اشخاص کا ذکر کلام اقبال میں ملتا ہے اور میرے خیال میں دنیا کے کسی شاعر نے اتنی بری تعداد میں شخصیتوں سے کام نہیں لیا ہے۔''(44)

کلام اقبال میں نطسے، کارل مارکس، لینن، برگساں، طالسطائی، آئن سٹائن، مسولینی، انگریزی شاعر بائرن، شیکسپیئر، میکاولی، رومی، جماالدین افغانی، سعید حلیم پاشا، عطار، ٹیپو سلطان، نادرشاہ، احمد شاہ ابدالی، مہدی سوڈانی، شیخ سرہندی، ہارون الرشید، محمود وایاز، غزنوی، تیمور، حضرت منصور، حافظ، مرزا بیدل، خاقانی، غالب، پستو کے مشہور شاعر خوش حال خان خٹک، فرستوں کا معزول سردار ابلیس، حضرت خضر علیہ السلام اشخاص کا ذکر ہے انہیں برے پیانے پر دو خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک خانے میں فرنگی و یوروپی فلسفی وحکماء اور دوسرے خانے میں اہل مشرق حکماء، صوفی وفضلاء۔ اس سلسلے میں پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

> ''کلام اقبال کی کلیدی شخصیتیں دو قسم کی ہیں اور یہ توسیم خود اقبال ہی کی کی ہوئی ہے ایک تو مغرب کے حکیمان فرنگ، دوسرے مشرق کے اصحاب نظر۔ اول الذکر نے ان کی عقلی تعلیم میں حصہ لیا ہے، اور ثانی الذکر نے ترتیب قلب میں''۔(45)

اقبال کی کچھ شخصیتیں ایسے بھی ہیں جن سے وہ محض ذاتی طور پر متاثر ہیں۔ فکر شاعر پر ان کے اثرات کا پتہ نہیں ملتا۔ یہ کچھ تو ان کے استاد بزرگ ہیں اور کچھ گہرے دوست اور رفیق کار۔ آرنلڈ، داغ، نظام الدین اولیا، (اسی میں میر حسن بھی شامل ہیں) سر راس مسعود، سر عبدالقادر، جسٹس شاہ دین ہمایوں ان کے علاوہ سر سید اور شبلی و حالی بھی اسی ضمن میں آتے ہیں۔

کچھ ایسے شخصیات ایسی ہیں جن کو اقبال نے صرف اپنی کوئی بات کہلوانے کے لیے متعارف کرایا ہے۔ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدّد الف ثانی، عالمگیر، طارق، عبدالرحمان اول، معتمد حاکم اشبیلیہ، ہارون رشید، ایڈورڈ ہشتم، ہنگری کا جوانا مرگ، شاعر پٹونی وغیرہ ایسے ہی لوگ ہیں۔ اقبال نے متذکرہ بالا شخصیات میں سے اکثر کو اپنے کلام مین جابجا اشارات کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یوں بھی اگر ان رجال کی فکر اقبال میں اصلی حیثیت کو ذرا ڈوب کر دیکھا جائے تو یہ سب کے سب پگھل کر محض چند علامات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جن کا مصرف اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ ذہن شاعر

کی پیچیدہ راہوں کی طرف واضح اشارے کرتے رہیں۔لیکن اتنے ہمہ گیرطور پر وسیع مفہوم سے قطع نظر بیسیوں شخصیتیں خالص علاقائی انداز میں پروئے اظہارلائی گئی ہیں،ان میں سے بیشتر یہ ہیں۔

پرویز دکوہکن ، دارا وسکندر، اویس رضی اللہ عنہ و بوذر رضی اللہ عنہ،کلیم وخلیل،حسین وحیدر و خالد، فاروق و صدیق، بلال وسلمان، رستم واسفندیار،سعدی وسلیمیٰ ،محمود وایاز ،ارسطوورازی، سیناوفارابی، چنگیزوآذر،ابولہب وابو جہل،نمرود وفرعون، یوسف واسماعیل، داود وسلیمان ،طغرل وارسلاں، سامری، یوسف وزلیخا، قیصر وکسریٰ،جنید و بایزید،نوح وایوب وغیرہ۔

مقالے کی آخر میں اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ اقبال کے سامنے اوربھی اشخاص تھے جنہیں چاہتے وہ مثبت ومنفی طور پرپیش کر سکتے ہیں اس فہرست میں پروفیسرعبدالمغنی نے ذیل کے ناموں کوپیش کیا ہے۔علامہ سید سلمان ندوی، سلطان صلاح الدین ایوبی، دانتے، فشٹے، میگ ٹگارٹ،جیمس وارڈ، شاہ ولی اللہ، شیخ سعدی، خسرودہلوی،شیخ غلام قادروغیرہ۔

تنقیدی زاویے (1993):-تنقیدی زاویے پروفیسرعبدالمغنی کی نواں مجموعۂ مضامین ہے۔ اسےثمرآفسیٹ نئی دہلی نے 1993 میں شائع کیا۔اس مجموعے میں کل اکیس مضامین درج ذیل عنوانات کےتحت ہیں۔

(1)مولاناابوالکلام کی عظمت

(2)اقبال کاشعری کارویّہ

(3)اقبال کانظام ظن

(4)اقبال اوروطنیت

(5)اقبال اورکلیم الدین احمد

(6) کلام اقبال میں سائنس کےاشارے

(7)آل احمدسرورایک ناقد کامل

(8)آل احمدسرورکی تنقیدنگاری

(9)فنی تنقیداورڈاکٹرمسعودحسین خان

(10)تنقیدمتن اور خلیق انجم

(11)قرۃالعین ایک منفردفن کار

(12)چاندی بیگم

(13)قاضی عبدالغفار بہ حیثیت ادیب

(14)لہو کے پھول ایک تنقیدی مطالعہ

(15)غلام عباس کی فن کاری

(16)کشمیری لال ذاکر کی ناول نگاری

(17)آدھے چاند کی رات

(18)جذبی کی شاعری

(19)روش صدیقی کی غزل گوئی

(20)ادبی صحافت

(21)اردوادب کی صحافت

اس مجموعے میں کئی اہم مضامین شامل ہیں۔جن میں اقبال کا شعری رویہ قابل غور ہے۔

اس مضمون میں اقبال کے انداز اور برتاؤ یعنی فن اور پیشکش سے بحث کیا گیا ہے۔ایک جانب اقبال کی شعریات تو دوسری جانب اس کے اطاقات پر بحث کی گئی ہے۔کلام اقبال میں Political Application اور Poetics کا سراغ لگایاہے۔

مختلف غزلوں اور نظموں سے نمونۂ اشعار پیش کرکے اقبال کا نظریۂ شاعری اور انداز پیش کش کو ثابت کیا ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی نے اس سلسلے میں کچھ اور اشعار پیش کیے ہیں۔جن سے اقبال کا خاص تصورفن اور مخصوص فن کارانہ کردار زیادہ وضاحت وصراحت کے ساتھ عیاں ہوتا ہے۔ان اشعار کی بنیاد پر پروفیسر عبدالمغنی نے ایسے نکات پیش کیے ہیں جوفکروفن کی مختلف جہتوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔جودرج ذیل ہیں:

''☆ شاعری خون جگر کی تخلیق ہے۔

☆ یہ ایک فطری چیز ہے۔

☆اس میں بے ساختگی ہونی چاہیے۔

☆ تکلف و تصنع سے موثر فن کاری ممکن نہیں۔

☆ ہر خیال اپنا پیکر خود لے کر پیدا ہوتا ہے۔

☆ اچھی شاعری کے لیے لفظ و معنی کا کامل ارتباط ضروری ہے۔

☆ شاعری کو موت نہیں، زندگی کا پیام بر ہونا چاہیے۔

☆ شعر میں سوز و ساز کا امتزاج ہونا چاہیے۔

☆ شاعری کا ایک اعلیٰ مقصد ہے، دل نوازی و دل کشائی۔

☆فن کار کو نقالی اور تقلید کے بجائے اجتہاد اور تجدید کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

☆ خشک فلسفہ نہیں، سرور انگیز محبت وسیع ترین معنوں میں بلند ترین شاعری کی جان ہے۔

اور پھر ان نقائط کو پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''یہ خیالات جس دور میں پیش کیے گئے تھے اس کے اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال اپنے زمانے سے بہت آگے تھے اور آج تک فن و شعر کے جو تازہ ترین اور بہترین نظریات سامنے آئے ہیں وہ اقبال کے تنقیدی افکار سے آگے نہیں بڑھ سکے ہیں''۔(46)

اقبال کے شعری رویے کا اظہار ان کی شاعرانہ تخلیقات میں کس طرح ہوا ہے، اپنے بات کو شعری استعارے میں کس طرح بیان کیا ہے، اور اس طرح بیان میں ان کے ذوق تکلم کا اندازہ کر سکتے ہیں۔طلوع اسلام کے ذیل کے چند اشعار پیش کرنے کے بعد رقم طراز ہیں ؎

عقابی شان جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے
ستارے شام کے خون شفق میں ڈوب کر نکلے

ہوئے مدفون دریا زیر دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھائے تھے جو بن کر گہر نکلے

''یہ اشعار سیاسی، فوجی، سائنسی اور صنعتی اشارات سے مملو ہیں۔ جنگِ عظیم اول 18-1914 میں جرمنی اور اس کے حریف اتحادی ممالک بہت ترقی یافتہ تھے۔ جنگ کے بعد مغربی و مسیحی اقوام نے مل کر مسلم ترکی پر حملہ کیا تو ان قوموں کے پاس عصرِ حاضر کے بہترین اسلحے، مادی وسائل اور تکنیکی آلات تھے۔ جنگ میں آب دوزوں کا استعمال پہلی بار ہوا۔ کیمیا کے بڑے بڑے کارنامے سامنے آئے۔ بجلی کے تاروں کا بھی خوب استعمال ہوا۔ ایک تو جرمنی کا قومی نشان عقاب تھا، دوسرے عقابی پروازیں یا یورشیں بہ کثرت ہو رہی تھیں۔ بہ ظاہر ابتدا میں معلوم ہوتا تھا کہ سائنس اور ٹکنالوجی میں جرمنی کی ترقیات و ایجادات یورپ کے دوسرے ملکوں سے زیادہ ہیں۔ جرمنی کے حملے بھی بڑی تیزی سے ہوئے اور بہت دور تک کیے گئے۔ بہرحال، اتحادیوں کے مقابلے میں جرمنی کو شکست ہوئی، مگر ترکی اپنی بے سروسامانی کے باوجود شکست نہیں کھا سکا۔ اس عجیب و غریب واقعے کو شاعر نے اسلامی تہذیب او مشرقی شاعری کے بہترین استعاروں میں بیان کیا۔ اردو غزل کے محاورات کا بھی نہایت ہنر مندانہ مصرف اس نے لیا۔ ایک واقعاتی بیان میں اقبال نے اتنی گہری شعریت کا اظہار کیا ہے کہ نقوش کلام سے سوز و گداز کی کیفیت ابھرتی ہے اور مفہوم کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے''۔(47)

پیام مشرق کی بہترین نظموں، مثلاً ''تسخیر فطرت''، ''نوائے وقت''، ''فصل بہار''، ''سرور انجم''، ''حدی''، ''محاورہ مابین خدا و انسان''، ''حور اور شاعر''، ''جوئے آب''، ''کشمیر'' کے علاوہ اور سب سے بڑھ جاوید نامہ کی جو شاعری ہے وہ نہ صرف اقبال بلکہ دنیائے ادب کا شاہکار ہے۔ شاعری کے لحاظ سے اس کا موازنہ اگر دانتے کی ڈوائن کامیڈی یا گوئٹے کی فاؤسٹ سے کیا جائے تو واضح ہوگا کہ خالص تمثیل کے اعتبار سے مغربی شعرا کی تخلیقات کی جو خوبیاں بھی ہوں، مگر خالص شعریت کے اعتبار سے ہمارے مشرقی شاعر کی فضیلت نمایاں ہے۔ اقبال نے

ڈراما نگاری نہیں، شاعری کی ہے اور منظوم تمثیلوں کے بجائے جو ایک سیاحت علوی ہے اور اس کا افلا کی سفر نامہ معراج النبی ﷺ کے نقشِ قدم پر ہے، کسی ماہر فلکیات یا ماہر نجوم کے نقشے پر ہیں ہے۔ یہ دراصل مشرقی تغزل کی روایت پر مبنی ہے، نہ کہ مغربی تمثیل کے نہج پر، گرچہ اس میں تمثیل وتغزل کے عناصر ایک خاص، ترکیب سے سموئے ہوئے ہیں۔ یہ ایک فلسفیانہ تخلیق ہے جو شعریت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس کا ہر کردار اپنی سرگزشت کے مطابق سامنے آتا ہے اور اس میں مختلف مواقع پر حسین ترین منظر نگاری بھی کی گئی ہے، مکالمہ نگاری بھی۔ یہ صرف ماضی کی داستان نہیں ہے، حال کا منظر نامہ اور مستقبل کا تخمینہ بھی ہے۔ روس اور اشترا کیت کے متعلق مثال کے طور پر اس میں جو پیش قیاسی کی گئی ہے اس کے اشارات آج دنیا کے سامنے واقعات کی شکل میں آ گئے ہیں۔

نظموں کے ساتھ ساتھ اقبال کی غزلیں بھی ان کے شعری رویے کی بہترین ترجمان ہیں۔

تنقیدی زاویے کا دوسرا اہم مضمون ''اقبال اور کلیم الدین احمد'' کے عنوان سے ہے۔ اس مقالے میں کلیم الدین احمد کی تنقید کا جائزہ لیا گیا ہے، کلیم الدین احمد کے تنقید میں تضاد کا نشان دہی کیا گیا ہے اور اقبال پر کلیم الدین احمد کے بیجا تنقید کا جواب بھی ہے۔

کلیم الدین احمد اپنی کتاب ''اردو شاعری پر ایک نظر'' میں اقبال پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اقبال ایسے شاعر تھے۔ جس کی اردو شاعری منتظر تھی مشرقی ومغربی ادب سے آشنا، نظم کے صحیح مفہوم سے باخبر شاعری کی ساری خوبیاں موجود تھی وہ چاہتے تو اردو شاعری کو پستی سے نکال کر بلندی پر پہنچا دیتے لیکن اس طرف اقبال نے توجہ نہ دی۔ شاعری کو قومی ترقی کا آلہ کار سمجھا، وہ اپنے خیالات اور مقصد میں کامیاب ہوئے مگر اردو شاعری تشنہ کام ہی رہی۔ اس کے جواب میں پروفیسر عبدالمغنی کہتے ہیں کہ جب اردو شاعری میر کی غزل، سودا کے قصیدے، انیس کے مرثیے میر حسن کی مثنوی اور غالب کے کلام باوجود پستی میں ہی رہی تو اقبال ایسے یکا یک بلندی پر کیسے پہنچا دیتے۔

پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں کہ:

> ''کسی زبان میں ادب کا ارتقا اس طرح نہیں ہوتا کہ کوئی فن کار یکا یک دامنِ کوہ سے چلانگ لگا کر چوٹی پر پہنچتے۔ ہر ادب کی روایت ہوتی ہیں جن میں ہی توسیع واجتہاد اور اضافہ کر کے ترقی کی منزلیں طے کی جاتی ہیں۔ لہٰذا اقبال بھی اردو غزل اور نظم کے ورثے سے انحراف نہیں کر سکتے تھے۔ چناں چہ کلیم

الدین احمد کی توقع غیر تنقیدی ہے''۔(48)

کلیم الدین احمد اشعار میں ربط، شاعری میں اظہار خیال کو ایک مرکز کے گرد چکر لگانے کو کمال امیتاز بتاتے ہیں جب کہ حقیقت اس سے الگ ہے۔اس کے جواب میں پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

''خیالات کی مرکزیت اور ترتیب کو اقبالؔ کی غزلوں کی خوبی بتایا گیا ہے، جب کہ درحقیقت تغزل سے اشعار وافکار کے ربط باہمی کا نام نہیں، یعنی یہ ربط کسی غزل کا نہ تو ترکیبی عنصر ہے نہ اس کے لیے وجہ امتیاز یا باعثِ کمال، غزل کے اشعار اور ان کے خیالات میں ربط ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔تاریخ ادب میں بہترین شاعروں نے بہترین غزلیں ربط کی ناگزیر شرط یا صفت کے بغیر کہی ہیں، خواہ وہ حافظؔ ہوں یا میرؔ یا غالبؔ۔اقبال کی متعدد غزلوں میں ربطِ اشعار یقیناً نمایاں ہے، مگر محض یہی ایک چیز ان کے کمال کا سبب نہیں''۔(49)

اقبال کے تعلق سے جو مشہور ہے کہ وہ پیغمبری کو شاعری سے زیادہ ضروری اور زیادہ اہم سمجھتے ہیں، سوتوں کو جگانا ہے اس لیے وہ پیغام اور صرف پیغام پر دھیان دیتے ہیں۔شاعرانہ محاسن اور تکنیک پر کافی دھیان نہیں دیتے اور ان چیزوں پر زیادہ غور وفکر نہیں کرتے نہیں۔

اقبال یقیناً ایک صاحبِ پیغام شاعر تھے اور ان کی فن کارانہ عظمت کے تار و پور، ان کی عظیم فکر سے ہی تیار ہوئے ہیں۔کلامِ اقبال میں فکر وفن کا کامل امتزاج ہے۔اس لیے کہ ان کی مخصوص فکر نے ہی ان کے فن کا وہ شاندار اسلوب ترتیب دیا ہے، جو منفرد طرزِ اقبال ہے اور کلام اقبال کے لیے ادبیاتِ عالم میں امتیاز کا باعث ہے۔

پروفیسر عبدالمغنی اقبالؔ پر لگے ان الزامات کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کیا فن واقعی پیغام سے خالی ہوتا ہے؟ کیا کوئی عظیم ادب آج تک کسی پیغام کے بغیر تخلیق کیا گیا ہے؟۔۔۔اقبال پیغام اور صرف پیغام پر دھیان دیتے ہیں۔۔۔شاعرانہ محاسن اور تکنیک پر کافی دھیان نہیں دیتے اور ان چیزوں پر زیادہ غور وفکر نہیں کرتے۔کیا صرف پیغام پر دھیان دینے اور کافی دھیان نہیں دینے میں کوئی فرق نہیں ہے؟ اسی طرح زیادہ غور وفکر نہ کرنے کا مطلب کچھ نہ کچھ غور وفکر تو ضرور کرتے ہیں''۔(50)

اس مضمون کے آخری حصے میں پروفیسر عبدالمغنی نے کلیم الدین احمد کی کتاب ''اقبال ایک مطالعہ'' پر مختصر بحث کیا ہے اوران کے تنقیدی شعور کا جائزہ پیش کیا ہے۔ساتھ ہی ساتھ کلیم الدین احمد کی غلطی اور تضاد بیان کا بھی نشان دہی کیا ہے۔جن شاعروں اور تخلیقی شہ پاروں سے اقبال موازنہ کیا گیا ہے اسے تقابلی معیار و ناقص کہتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں:

> ''سب سے پہلے بات یہ ہے کہ کلیم الدین احمد اقبؔال کی جن تخلیقات کی تعریف کرتے ہیں ان کا موازنہ بھی انگریزی شاعری کے چند نمونوں سے کر کے یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ اقبؔال اچھے شاعر ہوں تو ہوں، بہت اچھے شاعر نہیں، مثال کے طور پر وہ ''شاہین'' کی تحسین کر کے اس کا موازنہ The Wind Hover سے کرتے اور اردو نظم کے نقائص پر روشنی ڈالتے ہیں، حالاں کہ اوّل تو انگریزی نظم کا مصنف ہوپکنس کوئی بڑا شاعر نہیں، نہ ہی اس کو مذکورہ نظم کوئی عظیم شہ کار ہے، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہوپکنس ایک قسم کا متشاعر ہے اور اس کی نظم The Wind Hover بہت حسین تخلیق نہیں، ہوپکنس کے بعض بیانات تو اتنے مبہم ہیں کہ آئی، اے، رچرڈز جیسے ناقد کو ان کی تشریح کرنی پڑی، پھر بھی ان کے معانی واضح نہیں ہوئے اور بعض لفظ کا مفہوم آج تک متعین ہیں ہوا۔لہٰذا ''شاہین'' سے انگریزی نظم کا موازنہ صحیح نہیں اور بالکل لغو ہے۔
>
> اسی طرح ''لالۂ صحرا'' کا موازنہ ولیم بلیک کی نظم '' AH SUN FLOWER سے کیا گیا ہے۔نظم کی حیثیت سے یہ لالۂ صحرا سے بہتر ہے، اگر چہ اس میں وہ خیالات کی گہرائی نہیں جو لالۂ صحرا میں ہے۔یہ ایک عجیب و غریب فیصلہ ہے کہ جس نظم میں گہرائی کم ہے وہ اس نظم سے بہتر ہے جس میں گہرائی زیادہ ہے۔(51)

ملٹن کے ساتھ اقبال کے موازنہ کے تعلق سے وہ لکھتے ہیں:

> ''اقبال نے ملٹن کی طرح کوئی دیومالائی رزمیہ تصنیف نہیں کیا، جس میں اساطیری کرداروں کو خلافِ واقعہ سرگرمیوں میں مصروف دکھایا گیا ہے۔اقبال

کی شاعری صرف حقایق پر مبنی ہے اور تاریخی واقعات سے اعتنا کرتی ہے، نہ کو
بے بنیاد اور نا معقول افسانہ طرازی، پھر غنائیت میں اقبآل کو ملٹن پر فوقیت ہے
اور تنظیم ہیئت میں بھی وہ کسی سے کم نہیں''۔(52)

دانتے کی طربیہ خداوندی اقبال کے''جاوید نامہ'' سے کسی بھی طرح موازنے کے لائق نہیں۔ طربیۂ خداوندی مغربی شاعری کی انجیل قرار دیتے ہیں اور اس کی پرستش مغربی نقادوں کا پیشہ ہے۔ کیوں کہ مغربی نقادوں نے طربیہ کے قصیدہ خوانی میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے میں کوئی کسر نہیں باقی رکھا ہے۔طربیہ عہد وسطی کے سخت مذہبی تعصّبات کی تاریک خیالیوں کی آئینہ دار ہے۔ جب کہ اقبال کا''جاوید نامہ'' طربیہ کے مقابلے میں عصر حاضر کی بہترین روشن خیالی کی ایک اہم ترین فنی وفکری دستاویز ہے۔اس سلسلے میں سیرِ فلک کو جو نقشہ اقبال نے پیش نظر رکھا ہے وہ جغرافیائی وجود کے مباحث پر مبنی ہے۔ جاوید نامہ نہ صرف مشرقی بلکہ عالمی شاعری کا نقطۂ عروج ہے۔

اس کے علاوہ تنقیدی زاویے میں کئی اہم طویل مقالے شامل ہیں۔ جیسے کلام اقبال میں سائنسی اشارے، اقبال اور وطنیت ،آل احمد سرور، ایک ناقد کامل، آلِ احمد سرور کی تنقید نگاری ،تنقید متن اور خلیق انجم، قاضی عبدالغفار بحیثیت ادبی وغیرہ۔

فروغِ تنقید (1998):- فروغ تنقید پروفیسر عبدالمغنی کی وہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو''تنقیدی زاویے'' کی اشاعت کے بعد فرمایشوں پر لکھے گئے۔اس کتاب میں اردو تنقید کے ارتقاء پر ایک نئ جہت سے اپنے خیالات کا اظہار ہے۔اسے 1998ء میں ایم۔کے۔آفسٹ پرنٹرس دہلی نے شائع کیا۔

فروغ تنقید میں مقالات درج ذیل عناوین کے نام سے شامل ہیں۔

(1) اردو تنقید میں ارتقاء

(2) اردو ادب میں جدید رجحانات

(3)اقبال کی فطرت نگاری

(4)سرسید کا طرز تحریر

(5)ہمارے عہد میں اقبال کی معنویت

(6)ترقی پسندی

(7)فن تنقید کا اعلیٰ معیار اور ناقدین کا کردار

(8)ادب کیا ہے؟

(9)اردو زبان وادب کی رفتار ترقی

(10)ادب کا مواد وموضوع

(11)حسرت کی غزل گوئی

(12)نیاز فتح پوری کی ادبی خدمات

(13)ادب کی ہئیت

(14)نظم معریٰ اور نظم آزاد

(15)فن کار اور کردار

(16)شبلی کا تنقیدی کا زمانہ

فروغ تنقید کا پہلا مضمون بعنوان ''اردو تنقید میں ارتقاء'' ایک مفصل اور عالیمانہ مقالہ ہے۔اس میں اردو تنقید کی باضابطہ آغاز سے قبل یعنی اردو اور فارسی کے مشترکہ ادیبوں کے نگارشات سے آغاز کر کے تاحال نقادوں کا جائزہ پیش کیا ہے۔

تذکروں سے قبل اردو شاعری کی ابدائی دور میں معتدد شعراء نے اپنے کلام میں شعر کی ماہیت ،عناصر اوسر نوعیت کے متعلق بلیغ اشارے کیے ہیں۔جن میں ملاوجہی اپنی مثنوی ''قطب مشتری'' ولی دکنی کے اشعار میں شعر کی کیفیت پر تبصرے،میر تقی میر نے بھی اپنی شاعری کے منبع ومواد اور اسلوب وانداز پر روشنی ڈالی ہے گرچہ ادبی تنقید نہیں ہے۔صرف اس کا دیباچہ یا حاشیہ ہے۔

ان سے قبل جو تذکرے ہیں وہ ابتدائی دور کے اردو شعراء کے ہیں جو اکثر فارسی جانتے تھے اسی وجہ سے اٹھارویں صدی تک صرف فارسی تذکرے پائے جاتے ہیں۔تذکروں کے پہلے دور میں آب حیات سے قبل اردو و فارسی تذکروں میں نکات الشعراء از میر تقی میر 1752ء سے گلشن ہند از مرزا علی لطف 1801ء اور گلشن بے خار از

مصطفیٰ خان شیفتہ 1834ء سے انتخاب یادگار از امیر مینائی 1873ء اور اب حیات کے بعد دوسرے دور کے تذکروں میں چند نمایاں نام ذیل کے ہیں۔

گل رعنا مولفہ مولوی عبدالحئ، تذکرہ خندۂ گل مولفہ عبدالباری آسی، شعرالہند مولفہ عبدالسلام ندوی، کاشف الحقائق مولفہ امداد امام اثر وغیرہ۔

آب حیات کے بعد حالی اور شبلی نعمانی نے اردو تنقید کے ارتقاء میں نئے سنگ میل نصب کئے۔اس کے بعد عبدالحق، نصرالدین ہاشمی، نورالحسن ہاشمی ہوکر کلیم الدین احمد، آل احمد سرور، احتشام حسین، خلیل الرحمان اعظمی، وزیر آغا، قمر رئیس، شمس الرحمان فاروقی تک شامل ہے۔اردو تنقید کے ارتقا میں قدیم وجدید، مشرقی و مغربی اور فکری وفنی یا نظری و عملی ہر قسم کے رجحانات پرئے جاتے ہیں۔جدید تنقید میں بے راہ روی کا سبب بتاتے ہوئے پروفیسر عبدالمغنی رقمطراز ہیں:

> ''اردو ادب کی کوئی ایسی تاریخ ابھی تک نہیں لکھی گئی ہے جو ہر جہت سے مکمل و مستند ہو۔یہ کمی سب سے زیادہ تنقید کے سلسلے میں محسوس کی جاتی ہے۔مستقلطور پر تنقید کے متعلق جو کتابیں تصنیف کی گئی ہیں، ان میں بعض مفصل ہونے کے باوجود نہ تو تمام متعلقہ مباحث کا احاطہ کرتی ہیں نہ تمام رجحانات کا اندراج۔اس سلسلے میں سب سے بری کامی یہ ہے کہ بالعموم تحقیق و تنقید کے درمیان تمیز نہیں کی جاتی اس کے علاوہ دند نئ کتابوں یا پرانی کتابوں کی نئ ترمیم و اضافہ شدہ اشاعتوں میں بے جا تعصب اور صریح گروہ بندی کا ثبوت بھی ملتا ہے، جس کے نتیجے میں اہم نادقدوں کو یکسر نظر انداز کر کے غیر اہم تنقید نگاروں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔۔۔جدید تعلیم یافتہ اشخاص کے طلسم مغرب میں اسیر ہونے کی وجہ سے اردو ادب کے کمالات کی قدر شناسی کا حق پورے طور پر ادا نہیں ہوسکا ہے۔اردو تنقید کی یہ مغرب پرستانہ دانشوری اور محدود نظری بعض اوقات عجیب طریقوں سے ظاہر ہوئی ہے۔'' (53)

مقالے کے آخر میں تنقیدی گروہ کے آپسی اختلافا کے متعلق کہنا ہے کہ محض انشاپردازی اور گروہ بندی سے

کوئی مستقل مکتبِ فکر نہ قائم ہوتا ہے اور نہ ہوئی ہے۔ عجوبہ پسندی اور اسٹنٹ بازی تخلیق وتنقید نہ پہلے چلی ہے اور نہ ائندہ چلے گی۔ ان کا ماننا ہے کہ وہی تنقید کارآمد ہوگی جس میں دانش مندانہ سنجیدگی، عالمانہ وسعت نظر اور فن کارانہ ہنر مندی سبھی مثبت وموثر عناصر کا اجتماع ہو۔ اردو تنقید ایک آفاقی نقطہ نظر سے کام لے کر اپنی ادبی فن پاروں کی قدر و قیمت تعین کرنے کے ساتھ ساتھ دنیائے ادب سے انہیں تسلیم بھی کرا سکتی ہے۔ اگر اردو تنقید ادب کی قدر شناسی کا حق ادا کرتی ہے تو خود اس کی اپنی قدر پہلے سے بڑھ جائے گی اور یہی تنقید کے عروج کا آلہ ہوگا۔

فروغ تنقید کے مضامین میں ایک اہم مضمون ''فن تنقید کا اعلیٰ معیار اور ناقدین کا کردار'' ہے۔ اس میں جیسا کہ عنوان سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ فن تنقید اور نقاد کے فرائض ولا وازم کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

اس مضمون میں تنقید اور معیاری تنقید کے لئے تین چیزوں کو بنیادی قرار دیتے ہوئے پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

> ''کسی فن پارہ کی قدر کا تعین کے لیے حسب ذیل تین مراحل طے کرنے ہوں گے۔ نمبر ایک۔ تجزیہ، نمبر دو۔ موازنہ، نمبر تین۔ فیصلہ۔ تجزیہ مفہوم اور اس کے مضمرات کے ساتھ ساتھ اسلوب بیان کی کیفیات کی تشریح وتوضیح۔ موازنہ ایک تقابلی مطالعہ ہے جو زیر بحث پارہ ادب کو دوسرے پارہ ادب کے ساتھ ملا کر دیکھتا ہے کہ دونوں کے درمیاں خوبی وخامی کی نسبت کیا ہے۔ فیصلہ مجموعی وعمومی طور پر حسن وقبح کی وضاحت کے بعد زیر مطا لعہ ادبی تخلیق کی حیثیت واہمیت کی صراحت ہے۔ یہ تینوں مراحل تنقید کے عناصر ترکیبی ہیں اور جو تنقید جس حد تک ان عناصر پر مستمل ہوگی اس کا پیمانہ یا پایہ اتنا ہی بلند ہوگا۔'' (54)

اسی طرح مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ فن پارے کی قدر تعین کرنے کے لے نقاد کو کیسا ہونا چاہیے یا ناقد کے اندر کن کن صلاحیتوں کا ہونا ضروری ہے۔ پرفیسر عبدالمغنی تنقیدی صلاحیت کے لیے درج ذیل پانچ شرائط کو اہم قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اول۔ ادب کا وسیع مطالعہ، دوم۔ مطالعے کا ذہن میں محفوظ ہونا، سوم۔ سخن فہمی اور غیر جانب داری، چہارم۔ ادبی ذوق اور سماجی شعور، پنجم۔ منطقی دلیلوں کے ساتھ بحث وتمحیص'' (55)

حالی وشبلی کے بعد کوئی ایسا نقاد نظر نہیں آیا جس نے میر واقبال کی درست قدر تعین کیا ہو جیسا کی حالی نے غالب اور شبلی نے انیس شناسی میں کیا ہے۔آج تک ان دونوں عظیم شاعروں کے کمالات پر کوئی جامع اور تسلی بخش تنقید لکھی نہیں گئی ،حقیقت یہ کہ حالی اور شبلی بعد آنے والے ناقدین ان دونوں سے آگے تو کیا بڑھتے ،ان کے برابر بھی نہیں آ سکے۔اقبال کی شاعری جن ناقدوں نے پرکھا اول تو وہ فقط ادیب تھے عالم نہیں، دوسرا کہ ان کا ادبی مطالعہ بھی مشرقی تصورات ادب کے بجائے مغربی تصورات پر مبنی رہا ہے۔جبکہ اردو ادب کے تخلیقی فن پارے کی بنیادیں مشرقی تصورات پر قائم ہیں اور کوئی تنقید اپنے ادب کی تخلیق کے سرچشموں کو نظر انداز کر کے یا دوری رکھ کر اعلیٰ معیار تک نہیں پہنچ سکتی اور نہ ادب کے ساتھ انصاف۔

موجودہ تنقید بھی پیروی مغرب پر قائم ہے۔اردو تنقید میں ادب کا مطالعہ کم سے کم ہے اور مغربی ادبیات کا حوالہ زیادہ سے زیادہ ہے۔

''ادب کیا ہے؟'' فروغ تنقید میں ایک مختصر مگر پرمغز مقالہ ہے۔اس باب کے تحت ادب کی حقیقت اور ہئیتی تجربے کے متعلق اور مغرب کے زیر اثر ترقی پسندوں کے نئے نئے اور اجنبی اصطلاحات ،مواد، وہئیت ،فکر وفن پر مدلل گفتگو کی ہے۔

پروفیسر عبدالمغنی تنقید اور ادب کو اخلاقی پیمانے سے پرکھنے کے قائل ہیں۔اس لیے ان کی تنقیدی تصورات کو اخلاقی یا مشرقی تنقید کہا جاتا ہے۔وہ ادب کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''ادب اصل میں عربی زبان کا ایک لفظ ہے جس کا ایک مشتق لفظ تادیب ہے اور اس کا مفہوم نظم وضبط کی ترتیب ہے۔ادب ایک مفرد لفظ ہے جس کی جمع آداب ہے اور اس کا معنی سلیقہ واخلاق ہے۔''(56)

مغربی ادب میں ایک ایسا رجحان پیدا ہوا جس میں فن اور ہئیت ہی جیسے ادب ہو اور فکر ومواد کی اہمیت ان کے نزدیک بہت ہی ادنیٰ درجے کا چیز ہو۔اسلوب اور ہئیت کو نصب العین بنا دیا،اس کے تحت اسلوبیاتی نظام قائم ہو گیا۔

ہئیت کے معاملے میں آزاد نظم نگاری کے چکر میں نہایت ہی غیر شاعرانہ حرکات کیے گئے۔اس سے آگے بڑھ کر نثری نظم کے ذریعے شاعری کے قتل کا سامان کیا۔افسانے میں تجریدی، علامتی اور بے ماجرا افسانہ نگاری کا

کھیل کھیلا گیا۔اس سے ادب کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ پروفیسر عبدالمغنی اس سیاق وسباق میں لکھتے ہیں:

''تجربے کے نام پر فن کے ساتھ جو کچھ ہوا پوری بے فکری کے ساتھ ہوا۔ نئے معاشرے کے تنہا آدمی نے معاشرے کو نظر انداز کر دیا۔نتیجہ فرد سماج سے کٹ گیا۔ایک عام مایوسی، ذہنی پراگندگی اور انتشار خیال کی فضا جدیدی ادب پر طاری ہوگئی۔''(57)

ادب میں زندگی کا جو ناقص تصور ہے اسے کامیاب اور نتیجہ خیز ثابت کرنے کے لئے پرفیسر عبدالمغنی مقالے کے آخر میں کچھ اصلاحات رقمطراز ہیں جس سے ادب اور زندگی کے درمیان پھیلی ہوئی دوری کو مٹایا جاسکتا ہے:

''ادب اور زندگی میں پس ماندگی سے نکل کر، انسانی نقطۂ نظر کے مطابق ایک تہذیبی پیش رفت کا سامان ہو۔۔۔اس مقصد کے لیے جاننا اور سمجھنا پڑے گا کہ ادب دراصل فکر اور فن کی کامل ہم آہنگی کا نام ہے۔ یہ ہم آہنگی اس وقت تک نہیں پیدا ہوسکتی جب تک جمالیات اور اخلاقیات ایک دوسرے سے مربوط نہ ہو جائیں۔۔۔صحیح وصالح موضوع ومواد، معروف ومستند اسلوب وہئیت میں پیش کیا جائے۔۔۔شعر میں شعریت کو اور نثر میں سلاست، شاعری میں عروض کی پابندی ہو، افسانہ نگاری میں ماجرا سازی ہو اور تنقید میں واضح طور پر فکر وفن یا اخلاقیات وجمالیات کی ہم آہنگی پر زور۔''(58)

اسی طرح ایک اور مضمون ''ادب کا مواد وموضوع'' مختصر مگر موزوں اور مناسب مضمون ہے۔اس میں فکر وفن کے ساتھ ساتھ ادب کے موضوعات اور اس کے اثرات اور انسانی زندگی کے فحش، عشق وعاشقی، شاعری لطافت نہیں ثقافت وغیرہ پر مدلل بحث کیا ہے۔

اس مجموعہ میں ایک مضمون ''شبلی کا تنقیدی کارنامہ'' عنوان سے ہے۔اس میں شبلی کے تنقیدی تصورات، ان کا وسع المشر بی، علمی وسعت زبان وبیان، زبان کی شگفتگی، اسلوب اور تنقیدی وتجزیاتی انداز بیان شاعری کے لاوازم شبلی کے حوالے سے پیش کیا ہے۔

شبلی کی تنقیدی فکر اور ان کے تنقیدی عمل نے مل کر اردو تنقید کو منزل مقصود کا راستہ دیکھایا۔ان کے عالمانہ

نقطۂ نظر اور تجزیاتی اندازِ بیان نے ان اہم بنیادی موضوعات و مسائل کی گرہیں کھول کر رکھ دی ہیں جن میں اردو تنقید کے بعض حلقے آج تک الجھے ہوئے ہیں۔ اپنے خام خیالی میں تجدید ادب کی باتیں کر رہے ہیں۔ شبلی نے ان باتوں کو شعرالعجم میں پہلے ہی رقم کر دیا۔ پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

''اردو تنقید کے اس فکری ارتقاء کی بہترین مثال شبلی کی تنقیدی فتوحات ہیں۔ ان کے کمالات بہ یک وقت نظریاتی تنقید اور عملی تنقید دونوں پر مشتمل ہیں۔ شعرالعجم کے مختلف حصوں میں شبلی نے اصول تنقید سے بحث کرتے ہوئے اپنے اعلیٰ ادبی افکار پیش کیے ہیں جب کہ موازنہ انیس و دبیر میں انھوں نے عملی تنقید کا ایک بے مثال نمونہ پوری دنیائے ادب کے سامنے رکھا ہے۔ایسی کامل جامعیت دوسرے کسی تنقید نگار کے یہاں موجود نہیں۔'' (59)

شبلی و حالی کے متعلق خیال ہے کہ شبلی مشرقی انداز فکر زیادہ متعارف ہیں بہ نسبت حالی کے، شبلی ایک آزاد اور دور بین نگاہ رکھتے تھے حالانکہ حالی و شبلی دونوں ہی نے شاعری کے معاملے میں سادگی اور اصلیت کا ذکر کیا ہے۔ حالی بھی کم مغربی نہیں تھے انھوں اپنے بحث کا آغاز ہی ملٹن کے حوالے سے کیا ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی کے متعلق حالی اور شبلی کے نظریۂ تنقید کو یوں پیش کیے ہیں:

''حالی سب سے زیادہ زور سادگی، اصلیت اور جوش پر دیتے ہیں جب کہ شبلی سادگی ادا، واقعیت اور اصلیت کی اہمیت کا اقرار کرنے کے باوجود ان چیزوں کو شاعری کے اجزائے اصلی تسلیم نہیں کرتے کیوں کہ ان کے خیال میں شاعری کے عناصر ترکیبی محاکات اور تخیل ہیں۔ شعریت کے سلسلے میں ''تخیل'' کی تعریف حالی بھی کرتے ہیں، مگر وہ جب شعر میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئے کا بیان شروع کرتے ہیں تو سادگی، جوش اور اصلیت سے آگے نہیں بڑھتے۔ سادگی اور اصلیت کے تصورات یقیناً حالی اور شبلی کے درمیان مشترک نظر آتے ہیں لیکن سوال یہ کہ کون ان تصورات کو کتنی اہمیت دیتا ہے۔'' (60)

اسی طرح پورے مقالے میں حالی اور شبلی کے معرکتہ آراء تصنیف مقدمہ شعر و شاعری، شعرالعجم، موازنہ انیس

ودبیر کے حوالے سے بحث کیا ہے اور شبلی نعمانی کے تنقیدی شعور واضح طور پر پیش کیا ہے۔

اندازِ تنقید (2007):- اندازِ تنقید پروفیسر عبدالمغنی کے تنقیدی مضامین کا گیارہواں مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ کا نام ایک مضمون کے عنوان سے اخذ کیا گیا ہے۔ اندازِ تنقید 2007 میں کراون آفسیٹ، سبزی باغ، پٹنہ نے شائع کیا۔ مجموعے میں شامل مقالات کے عناوین درج ذیل ہیں:

(1) اندازِ تنقید

(2) شعریت اور شاعری

(3) میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ۔ عظمت شاعری کی تثلیث

(4) ادبی تنقید کے مکاتبِ فکر

(5) اکیسویں صدی میں اردو کو درپیش مسائل

(6) ادب کا مستقبل

(7) اقبال کے فن کی کیمیا گری

(8) مولانا عبدالسلام ندوی بہ حیثیت ماہر اقبالیات

(9) آل احمد سرور کی تنقید نگاری

(10) اردو ادب میں دانشوری کی روایت

(11) سکندر علی وجد کی نظم نگاری

(12) جگرؔ مرادآبادی کی شاعری کی اہمیت

(13) ذوق کا تغزل

(14) مولانا ابوالکلام آزاد کا اسلوب نگارش

(15) جگن ناتھ آزاد کی شاعری کا کارنامہ

(16) جمیل مظہریؔ کی شاعری

(17) ڈاکٹر ابن فرید کی تنقید نگاری

(18) قاضی عبدالستار بہ حیثیت ناول نگار

(19) کلیم عاجز کی غزل گوئی

(20) شاعری کا مستقبل

(21) افسانہ و ناول نگاری کا مستقبل؟

(22) تنقید کا مستقبل؟

(23) اردو ادب میں بین الاقوامی تنقیدی رجحانات

جگر مرادآبادی کی شاعری کی اہمیت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ پروفیسر عبدالمغنی کے نزدیک جگر غزل کے شاعر ہیں اور والہانہ تغزل کے اعتبار سے اپنے ہم عصروں میں سب سے ممتاز، مشہور اور مقبول ہیں۔ اور ان کی شاعری کی اہمیت اس سے بھی ہے کہ انھوں نے غزل کے کلاسیکی محاورات و استعارات میں روح عصر کی ترجمانی کی ہے۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ شاعری میں جب تک ایک سرور کی کیفیت نہ ہو اچھی شاعری نہیں۔ سرور کے ساتھ ساتھ معنویت کا ہونا بھی لازمی ہے۔ اور جگر کی شاعری میں یہ دونوں چیزیں بدرجہاتم موجود ہیں۔ اسی لیے پروفیسر عبدالمغنی یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ:

> ''جگر وسیع ترین معنوں میں درد جگر کے شاعر ہیں۔ ان کے دل میں چوٹ عام یا خاص ذاتی یا آفاقی مفہوم میں حسن نے لگائی ہو یا زمانے نے ان کا کلام ایک دردمند دل کی پکار ہے۔ یہ ایک نالہ عشق ہے جو نغمے کی صورت میں ڈھل گیا ہے۔ جگر کی طبیعت کا وفور اور سرور دونوں درد دل کی وجہ سے ہے۔ یہ صحیح معنوں میں تغزل کے سوز و گداز کا کرشمہ ہے''۔ (61)

مذکورہ بالا اقتباس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ جگر کی شاعری اخلاقی اقدار سے پُر ہے اور یہی وہ نکتہ ہے جسے پروفیسر عبدالمغنی نے اس مضمون میں پیش نظر رکھا۔ بقیہ مضامین بھی پروفیسر عبدالمغنی کی تنقیدی موقف کی ترجمانی کرتے ہیں۔

حواشی

1 نقطہ نظر،عبدالمغنی مطبوعہ دی آزاد پریس،سبزی باغ پٹنہ،1965 ص،ج تاد
2 جادۂ اعتدال،عبدالمغنی مطبوعہ سن 1972،ص ح
3 معیاروا قدار،عبدالمغنی مطبوعہ لیبل لیتھو پریس،رمنہ روڈ، پٹنہ 1981،ص،دتاہ
4 جادہء اعتدال،عبدالمغنی،مطبوعہ کتاب منزل سبزی باغ پٹنہ مطبوعہ سن 1972ءص
5 تشکیل جدید،عبدالمغنی مطبوعہ دی آرٹ پریس،سلطان گنج 1976 ,ص،ہ
6 معیاروا قدار،عبدالمغنی،مطبوعہ لیبل لیتھو پریس،رمنہ روڈ پٹنہ،1981،ص،ب
7 جادہ اعتدال،عبدالمغنی،مطبوعہ کتاب منزل سبزی باغ پٹنہ مطبوعہ سن 1972ءص،ح تاط
8 تشکیل جدید،عبدالمغنی مطبوعہ دی آرٹ پریس سلطان گنج، پٹنہ 1976,ص،ج
9 نقطہ نظر،عبدالمغنی مطبوعہ دی آزاد پریس،سبزی باغ، پٹنہ،1965،ص،127
10 نقطہ نظر،عبدالمغنی مطبوعہ دی آزاد پریس،سبزی باغ پٹنہ 1965,ص،153
11 تنقیداور عملی تنقید،دوسراایڈیشن،احتشام حسین
12 تشکیل جدید،عبدالمغنی مطبوعہ دی آرٹ پریس سلطان گنج پٹنہ،1976,ص، 272 تا273
13 نقطہ نظرعبدالمغنی مطبوعہ دی آرٹ پریس سبزی باغ پٹنہ، 1965،ص،ج تاد
14 نقطہ نظرعبدالمغنی مطبوعہ دی آرٹ پریس سبزی باغ پٹنہ،1965,ص،5
15 نقطہ نظرعبدالمغنی مطبوعہ دی آرٹ پریس سبزی باغ پٹنہ،1965،ص،13
16 نقطہ نظرعبدالمغنی مطبوعہ دی آرٹ پریس سبزی باغ پٹنہ،1965،ص،15
17 نقطہ نظرعبدالمغنی مطبوعہ دی آرٹ پریس سبزی باغ پٹنہ 1965,ص17,
18 جادہ اعتدال،عبدالمغنی . مطبوعہ کتاب منزل سبزی باغ پٹنہ،1972,ص،ہ تاو
19 جادہ اعتدال عبدالمغنی مطبوعہ کتاب منزل،سبزی باغ، پٹنہ 1972,ص،ح

20 جادہ اعتدال عبدالمغنی مطبوعہ کتاب منزل، سبزی باغ پٹنہ، 1972, ص، 44

21 جادہ اعتدال، عبدالمغنی مطبوعہ کتاب منزل، سبزی باغ، پٹنہ، سن 1972 ص، 108 تا 109

22 تشکیل جدید، عبدالمغنی، مطبوعہ دی آرٹ پریس سلطان گنج پٹنہ 6، 1972، ص، 270،269

23 ایضا، ص، 108

24 عبدالمغنی اردو کی ایک عبقری شخصیت، ڈاکٹر شفیع الزماں، پاکیزہ افسیٹ شاہ گنج پٹنہ، 2013، ص، 73

25 تشکیل جدید، عبدالمغنی، مطبوعہ دی آرٹ پریس سلطان گنج پٹنہ 6، 1972، ص 110,111,

26 ایضا، ص، 172،171

27 معیار واقدار، عبدالمغنی، مطبوعہ حکمت پبلیکیشنز پٹنہ، 1981، ص، دتاح

28 تنقید مشرق، عبدالمغنی، مطبوعہ جمال پرنٹنگ پریس دہلی، 1987، ص، 30،29

29 ایضا، ص، 30

30 ایضا، ص، 33

31 تصورات، عبدالمغنی، مطبوعہ لکشمی پریس، دریا گنج دہلی 2، 1988، ص، 26

32 ایضا، ص، 33

33 ایضا، ص، 34،33

34 ایضا، ص، 34

35 ایضا، ص، 84،83

36 اسلوب تنقید، عبدالمغنی، عاکف بک ڈپو، مٹیا محل دہلی 6، 1989، ص، 7

37 ایضا، ص، 45

38 ایضا، ص، 52،51

39 ایضاً،ص، 57

40 تنویر اقبال،مصنف،عبدالمغنی،مطبوعہ،زاہد بشیر پرنٹرس لاہور،اشاعت 1990،ص 8

41 تنویر اقبال،مصنف،عبدالمغنی،مطبوعہ،زاہد بشیر پرنٹرس لاہور،اشاعت 1990،ص 12

42 تنویر اقبال،مصنف،عبدالمغنی،مطبوعہ،زاہد بشیر پرنٹرس لاہور،اشاعت 1990،ص 17

43 تنویر اقبال،مصنف،عبدالمغنی،مطبوعہ،زاہد بشیر پرنٹرس لاہور،اشاعت 1990،ص 22،23

44 تنویر اقبال،مصنف،عبدالمغنی،مطبوعہ،زاہد بشیر پرنٹرس لاہور،اشاعت 1990،ص 162

45 تنویر اقبال،مصنف،عبدالمغنی،مطبوعہ،زاہد بشیر پرنٹرس لاہور،اشاعت 1990،ص 162

46 تنقیدی زاویے،مصنف،عبدالمغنی،مطبوعہ،ثمر آفسیٹ پرنٹرس دہلی،اشاعت 1993،ص 24

47 ایضاً،ص 28

48 ایضاً،ص 60

49 ایضاً،ص 61

50 ایضاً،ص 63

51 ایضاً،ص 67

52 ایضاً،ص 68

53 فروغِ تنقید،مصنف عبدالمغنی،مطبوعہ ایم۔کے آفسیٹ پرنٹرس دہلی،اشاعت 1998،
ص 27،7

54 ایضاً،ص 109،110

55 ایضاً،ص 110

56 ایضاً،ص 116

57 ایضاً،ص 117

58 ایضاً،ص 118,119

59 ایضاً،ص153

60 ایضاً،ص155,156

61 انداز تنقید،عبدالمغنی،مطبوعہ کراؤن آفسیٹ،سبزی باغ پٹنہ 4،2007،ص،127

باب سوم

پروفیسر عبدالمغنی کی اقبال شناسی

پروفیسر عبدالمغنی کی اقبال شناسی

گزشتہ باب میں پروفیسر عبدالمغنی کی تنقید نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کے گیارہ تنقیدی تصانیف جو ایک جدید تنقیدی فکر یا نظام تنقید کی تشکیل کرتا ہے۔ جو زندگی ، ادب و تہذیب کے متعلق ان کے افکار و خیالات پر مبنی ہے۔ جسے ہم مشرقی یا اخلاقی تنقید کے نام سے جانتے ہیں قدر تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

> ''میری گیارہ تنقیدی کتابیں مل کر ایک نظم تنقید کی ترکیب کرتی ہیں۔ جو زندگی، ادب اور تہذیب کے متعلق میرے ان افکار و خیالات پر مستمل ہیں جن کا اظہار میں پچھلے چالیس سال سے مسلسل کرتا رہا ہوں۔''(1)

اس باب میں ہم پروفیسر عبدالمغنی کے اقبال شناشی یعنی ان کا مطالعہ اقبال کے تعلق سے پروفیسر عبدالمغنی کے تنقیدی فکر کا جائزہ پیش کریں گے۔

پروفیسر عبدالمغنی کا ذہنی رو۔جحان سب سے زیادہ اقبال افکار وفن کا مطالعہ رہا ہے۔اس کی اصل وجہ انہیں فکر اقبال سے ذہنی ہم آہنگی، مشرقی تہذیب وثقافت کے ساتھ ساتھ ادب وتنقید میں مذہبی، اخلاقی اور مشرقی اقدار کے قائل ہیں جو اقبال کے یہاں اعلیٰ پیمانے پر پائے جاتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ ادبی رجحانات کو مذہبی رجحانات سے ہم آہنگ کرنا چاہیے۔جس طرح مغربی ادب میں دانتے کا طربیہ خداوندی (Divine Comedy) مسیحی دنیات و اخلاقیات، گوئٹے کا فاوسٹ (Foust) اور ملٹن کی فردوس گمشدہ (Paradse Lost) ہے۔اسی طرح ایلیٹ نے اپنی آخری عمر میں تنقیدی نظریات کو عیسائیت سے جوڑ دیا ہے ویسے ہی اسلامی نظریات کا اردو ادب پر نقش ہونا ضروری ہے۔

پروفیسر عبدالمغنی کو کلام اقبال سے دلچسپی ہی نہیں ایک حد تک عشق اور ان کے فکر و اظہار و طرز کے شیدا ہیں۔ اقبال کے کلام میں جو مشرقی اسلامی نقوش پیوست ہے یہی پروفیسر عبدالمغنی کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔اس تعلق سے

پروفیسر عبدالمغنی خود لکھتے ہیں:

''میں نے اپنی علمی وادبی زندگی کی ابتدا سے اقبال کے فکر وفن کا مطالعہ مختلف پہلوں سے کیا ہے، مضامین بھی لکھے ہیں اور کتابیں بھی تصنیف کی ہیں زیادہ تر اردو میں کبھی کبھی انگریزی میں۔''(2)

پروفیسر عبدالمغنی ادب میں اسلامی فلسفۂ حیات کے قائل ہیں اور شاید اسی لیے وہ اپنی علمی وادبی زندگی کی ابتدا سے ہی اقبال کا مطالعہ مختلف پہلوں وزاویؤں سے کیا ہے۔ کیوں کہ اقبال کے یہاں اسلامی فکر وفن کے شاہکار نمونے بھرے پڑے ہیں۔ پروفیسر عبدالمغنی اپنی کتاب تشکیلِ جدید کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''اگر میری تنقید میں قدامت، مذہبیت اور اسلامیات کے عناصر پائے ہی جاتے ہیں تو کیا جرم ہے؟۔۔۔اقبال کی شاعری میں اسلام، ٹیگور کی شاعری میں ویدانیت اور ٹی۔ایس۔ ایلیٹ کی تنقید اور شاعری میں مسیحت۔۔۔ کوئی عیب تو نہیں؟۔''(3)

درج بالا اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ پروفیسر عبدالمغنی، اقبال، ٹیگور اور ٹی۔ایس۔ ایلیٹ کی طرح ادب و تنقید میں مذہبی خیال وافکار کے خواہاں ہیں۔ انھیں نا تو جدیدی ہونے کا شوق ہے اور نا تو دہریت کو پسند کرتا ہے جبکہ اسلامی تصورِحیات پر انہیں فخر ہے۔

پروفیسر عبدالمغنی کو اسلام پسندی پر فخر ہے اور وہ ذہنی وفکری نقطۂ نظر سے اقبال کے بہت قریب ہیں اسی لیے انھوں نے اقبال پر مختلف عناوین سے اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ لکھے ہیں۔ انہوں نے اقبال کو ادبی دنیا میں پڑھنے اور سمجھنے کا ایک نیا زاویہ عطا کیا ہے۔ ذیل کے عناوین سے پروفیسر عبدالمغنی کے مطالعۂ اقبال یا اقبالیات کا اندازہ بخوبی کر سکتے ہیں۔ جیسے ''اقبال اور شخصیتیں''، ''اقبال کا فن''، ''موازنہ اقبال وغالب''، ''اقبال کی انسان دوستی''، ''کلامِ اقبال کی اشاریت''، ''عالمی ادب میں اقبال کا مقام''، ''اقبال اور نئی دنیا''، ''اقبال اور کارل مارکس''، ''اقبال اور ٹی۔ایس۔ ایلیٹ''، ''اقبال کی حقیقت وعظمت''، ''اقبال اور دہریت''، ''اقبال کا شعری رویہ''، ''اقبال اور وطنیت''، ''اقبال اور کلیم الدین احمد''، ''کلامِ اقبال میں سائنس کے اشارے''، ''اقبال کی فطرت نگاری''، ''میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ......عظمتِ شاعری کی تثلیث''،

''اقبال کے فنِ کیمیا گری'' وغیرہ۔ایسے ضخیم مقالات ہیں جو اپنے آپ میں مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔اس کے علاوہ پروفیسر عبدالمغنی کے کئی مدلل تصنیف ہیں۔ان میں ''اقبال اور عالمی ادب'' عبدالمغنی کی معرکتہ الآرا تصنیف ہے۔اسے سب سے پہلے کریسنٹ پبلی کیشنز (گیا، بہار) نے 1882ء میں شائع کیا اور اس کا دوسرا ایڈیشن 1990ء کو پاکستان لاہور سے اقبال اکادمی نے شائع کیا۔''اقبال کا نظامِ فن'' 1984ء میں ''اقبال کا نظریۂ خودی'' 1990ء میں، ''اقبال کا ذہنی وفنی ارتقا'' 1991ء میں، ''اقبال دی پوئٹ (انگریزی)'' 1990/92ء میں اور ''تہذیبوں کا تقابلی مطالعہ فکرِ اقبال کی روشنی میں'' 2001ء میں منظرِ عام پر آیا۔

اپنی پہلی کتاب اقبال اور عالمی ادب نے پروفیسر عبدالمغنی کو اقبال فہمی اور ماہرِ اقبالیات کے فہرست میں شامل کر دیا تھا۔یہ کتاب اردو کے مشہور نقاد بت شکن کلیم الدین احمد کی تصنیف ''اقبال۔۔ایک مطالعہ'' کا جواب ہے۔جس میں کلیم الدین احمد نے علامہ اقبال کو ایک معمولی سطح کا شاعر ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔کسی نے اقبال کو شاعرِ مشرق تو کسی نے شاعرِ اسلام کا لیبل لگا کر انہیں محدود کرنے کی ناکام کوشش کی ہیں۔بعض نقادوں نے انہیں فکری تضاد کا شکار بتایا تو بعض نے علامہ کو فاشسٹ بھی کہا ہے۔اپنی کتاب ''اقبال اور عالمی ادب'' میں پروفیسر عبدالمغنی نے اقبال کے معترضین کا جواب بہت معقول اور مدلل انداز میں دیتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ علامہ اقبال کا اردو ادب میں ہی نہیں دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں میں ممتاز اور اہم مقام ہے۔

یہ فطری عمل ہے کہ جب کوئی شخص جذباتی وابستگی رکھتا ہے تو وہ اس کے کارناموں کی تعریف وتحسین میں مبالغہ آمیزی سے کام لے کر انتہا تک پہنچ جاتا ہے۔لیکن پروفیسر عبدالمغنی کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جاسکتی۔پروفیسر عبدالمغنی کا اپنا ایک خاص تنقیدی نقطۂ نظر ہے۔وہ تنقید میں اعتدال کے ذریعہ تنقید میں تشکیلِ جدید کے علمدار ہیں۔انھوں نے تنقیدی میدان میں اعتدال وتوازن پسندانہ راستہ اختیار کیا ہے۔اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اقبال کو پرکھنے اور چھان پھٹک نے کے معاملے میں توازن برتنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔پھر بھی کہیں کہیں جذباتی وابستگی کے وجہ سے ان کے لہجے میں کچھ جوش وخروش کا عنصر پیدا ہو گیا ہے۔لیکن ہم اسے پروپگینڈہ سے تعبیر نہیں کر سکتے جیسا کہ بعض نقادوں کے یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

اردو ادب وتنقید اور اقبال کے موضوع پر پروفیسر عبدالمغنی نے بہت لکھا ہے۔اب ہم ذیل میں پروفیسر عبد

المغنی کی اقبال شناسی فکروفن کے حوالے سے بحث کریں گے۔ پروفیسر عبدالمغنی کو کلام اقبال سے دلچسپی ہی نہیں ایک حد تک عشق اوران کی فکر وطرزِ اظہار کے شیدا تھے۔ بقول شبّر امام ''ڈاکٹر صاحب کا ویسے تو کوئی خاص موضوع کا تعین کرنا مشکل ہے مگر اقبال اور اقبالیات کو کہا جائے کہ ڈاکٹر صاحب کا خاص موضوع ہے تو بے جا نہ ہوگا''۔

ہمیں دیکھنا ہے کہ انھوں نے اقبال کی شاعری کے اوصاف کس طرح بیان کیے ہیں اور شاعری میں کن کن شعرا پر فوقیت دی ہے اور کس طرح کس مختلف درجہ دی ہے۔ اقبال کی شاعری کا دائرہ وسیع تر ہے، ان کی شاعری کے مختلف جہات ہیں۔ ان تمام جہتوں پر الگ الگ سے انھوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کی شاعری کے تعلق سے پروفیسر عبدالمغنی کی تنقیدی فکر وشعور پر پرکھ خیال کا اظہار کرنے سے اور کسی نتیجے پر پہنچے کے لیے الگ الگ موضوع قائم کر کے لکھا جائے تا کہ وضاحت ہو جائے۔ سب سے پہلے اقبال کی ''نظمیہ شاعری'' کے حوالے سے پروفیسر عبدالمغنی کی تنقید نگاری کا جائزہ لیا جائے۔

اقبال کی نظمیہ شاعری کا کینوس بہت وسیع ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اسلامی تاریخ سے روشنی حاصل کی اور اپنا ایک نقطۂ نظر واضح کیا۔ انہیں بطور خاص قدرتی مناظر سے محبت تھی اور حد درجہ فطرت کے شیدا تھے۔ ان کی کئی نظمیں فطرت نگاری کے عمدہ نمونے پیش کرتی ہیں۔ اسی طرح انہوں نے وطن دوستی، انسان دوستی، مردمومن، نظریۂ خودی جیسے موضوعات پر اپنی نظموں میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان کی شاعری کا ایک روشن پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اسلامی تاریخ اور مسلمانوں کے عروج و زوال کا بھی احاطہ کرتی ہیں۔ موجودہ عہد میں مسلمانوں کی نمائندگی کس طرح سے ہو اور وہ اپنا کھویا ہوا وقار کس طرح حاصل کریں، اس جانب بھی اقبال نے خصوصی توجہ دی ہے۔ پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد پورے ملک پر انگریزوں کا قبضہ باضابطہ ہو چکا تھا، یہاں کے باشندے اب ان ہی کے ماتحت رہ کر اپنی بقا کی تلاش میں سرگرداں تھے اور اب وہ کسی جنگ کے لیے جسمانی طور پر قطعی تیار نہیں تھے۔ ممکن ہے دلوں میں خلش رہی ہو لیکن زبان پر افسوس کا کوئی جملہ نہیں تھا۔ اقبال نے وطن دوستی اور حب الوطنی کے جذبے کو ایک نئے رنگ سے اُبھارا اور رفتہ رفتہ وہ خلش جو دل کے کسی گوشے میں دفن تھی پھر سے سرابھارنے لگی۔ یہ خلش نئی نسلوں تک منتقل ہوئی اوران کے کارہائے نمایاں نے بالآخر دوسری جنگ آزادی میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد ملک کو آزادی دلائی۔ آزادی کا سہرا جہاں ہزاروں مجاہد آزادی، صحافی، شاعر وادیب،

لیڈران اورعوامی کارکن کو جاتا ہے، وہیں اقبال کو بھی جاتا ہے۔انھوں نے حب الوطنی کی جو شمع جلائی تھی وہ بالآخر کامیاب ہوئی اور ملک کو آزادی نصیب ہوئی۔ حالاں کہ وہ اس آزادی کو دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہے کیوں کہ آزادی حاصل ہونے سے کئی سال قبل ہی (1938) میں وہ اس دارفانی سے کوچ کر گئے تھے۔

حب الوطنی

حب الوطنی اقبال کے یہاں جا بجا دیکھنے کو ملتی ہے۔اقبال کے بعض ناقدین نے اقبال کو وطن پرست ثابت کرنے کی کوشش بھی کی ہے لیکن اقبال حب وطن، ملک دوست تھے، وطن پرست ہرگز نہ تھے۔ کیوں کہ اقبال تو اسلام پرست تھے،ان کے نزدیک اسلام ہی پرستش کے قابل تھا۔ ہاں!وطن دوستی بھی انہیں اسلام پرستی کے وجہ سے ملی تھی۔ پروفیسر عبدالمغنی جنھوں نے اقبال کے تمام شعری پہلوؤں پر گفتگو کی ہے اس تعلق سے بڑی اہم بات کہتے ہیں:

> ''اقبال وطن پرست اپنی شاعری کے کسی دور میں نہیں تھے، ہو بھی نہیں سکتے تھے، وہ ایک خدا پرست تھے اور اول سے آخر تک وطن دوست یا محبّ وطن رہے''۔(4)

اقبال کے تعلق سے اس طرح کی باتیں عام طور پر سننے یا پڑھنے کو ملتی رہی ہیں کہ وہ اسلام پرست اور خدا پرست تھے اور اقبال نے ہی دوقومی نظریہ کی بنیاد ڈالی اور ملک کی آزادی کے بعد پاکستان کا وجود اسی دوقومی نظریے کی وجہ سے ہوا ہے۔ حالاں کہ اس مین ذرا سی بھی سچائی نہیں ہے، یہ صرف اقبال کی اہمیت کو کم کرنے کی غرض سے پروپیگنڈہ پھیلایا گیا ہے۔اس کو حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔اقبال کی وطن سے محبت کے نمونے بہت پہلے سے تھے قیام پاکستان کی بات تو کچھ ہی عرصے قبل کی بات ہے۔اقبال کی وطن دوستی پر کسی طرح کا شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ترانۂ ہندی ایسے اعتراضات کے لیے کافی ہے ؂

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اقبال قیام پاکستان کے بعد ہجرت فرما گئے لیکن ان کی ہندستان سے محبت کی جو دلیلیں اور شواہد ہیں انھیں کسی

طرح مٹایا نہیں جا سکتا ہے۔ ذیل کے اشعار انھیں محبِّ وطن اور ہندستان کی زمین سے الفت کا ثبوت پیش کرتی ہے۔

چشتی نے جس زمیں پہ پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے
میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے
میرا وطن وہی ہے

اقبال کی ایک مشہور نظم ''نیا شوالہ'' ہے جو اس طرح کے خیالات رکھنے والے ناقدین ادب کی جسارت کو اکساتی ہے جو اقبال کو وطن پرست کہنے اور ثابت کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ ان ناقدین ادب کا کہنا ہے کہ اقبال تمام مذاہب سے الگ ایک ''نیا شوالہ'' قائم کرنا چاہتے تھے جس میں وطن کو مذہب پر فوقیت حاصل ہو۔ جب کہ حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے۔ مذہب اپنی جگہ ہے اور وطن اپنی جگہ، ان دونوں میں اگر فوقیت دی بھی جائے گی تو ہر حال میں مذہب کو دی جائے گی۔ پروفیسر عبدالمغنی نے ''نیا شوالہ'' کے تعلق سے اظہار خیال کرتے ہوئے اس شعر کے ساتھ ٹیپ کا شعر بھی نقل کیا ہے۔

سچ کہہ دوں! اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
پتھر کی موتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

ان اشعار کے بعد پروفیسر عبدالمغنی کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''اقبال کا مقصد پتھر کی مورتوں میں خدا کے وجود کی تردید ہے اور اس تردید میں زور پیدا کرنے کے لیے انھوں نے خاک وطن کے ہر ذرے کو دیوتا ہونے کا خیال پیش کیا ہے۔ جس کا بہترین مفہوم یہی ہو سکتا ہے کہ خدا کا جلوہ تو زمین کے ہر ذرے میں ہے۔ لہذا چند مورتیوں کو مظہر خداوندی سمجھ کر انھیں پوجتے اور

> دوسرے لوگوں کو نا پوجنے پر انھیں تفرقے کا الزام دینے کی کیا ضرورت ہے۔ معلوم ہو کہ خطاب برہمن سے ہے، اور تو کا صیغہ واحد حاضر پورے بند میں ہر جگہ برہمن کے فرقہ پرستانہ دلیلوں کا ایک الزامی جواب ہے۔ رہی یہ بات اس بند میں وعظ اور پھر دیر و حرم کو چھوڑنے کی تو ظاہر ہے کہ اقبال جس چیز کی مذمت کر رہے ہیں۔ خواہ ہندو کی ہو یا مسلمانوں کی۔ یہ فرقہ پرستی اقبال کے خیال میں حب وطن اور اتحاد وطن کو غارت کرنے والی ہے۔ اور چوں کہ دونوں مذہبوں کا استحصال اس فرقہ پرستی کے لیے کیا جاتا ہے۔ لہٰذا شاعر دونوں طرف کے مذہبی فرقہ پرستوں اور تفرقہ پردازوں کی مذمت کر رہا ہے''۔(5)

اس طرح پروفیسر عبدالمغنی کے اقبال کی شاعری کے اس اہم پہلو جس پر اکثر گفتگو ہوتی رہی ہے کہ اقبال اسلام پرست ہیں یا وطن پرست، جیسا کہ ان کی نظموں میں حب الوطنی کا جذبہ دیکھنے کو ملتا ہے، اس سے انھیں وطن پرست ثابت کرنے میں ناقدین ادب کو آسانی ہوتی ہے لیکن پروفیسر عبدالمغنی نے اپنے دلائل سے یہ واضح کر دیا ہے کہ اقبال اسلام پسند اور خدا پرست تھے اور انھیں محبّ وطن یا وطن دوست کہا جانا چاہیے۔ جہاں تک کلام اقبال میں مذہب اسلام کے تعلق سے کچھ نظمیں ملتی ہیں اور جو ان کی شاعری کا ایک خاص رنگ ہے۔

فطرت نگاری

اقبال کی نظمیہ شاعری کا ادنیٰ قاری بھی ان کی فطرت نگاری سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کی پوری نظمیہ شاعری میں مظاہر فطرت کے اعلیٰ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں اور جس نے ان کی شاعری کو اردو شاعری میں ممتاز مقام عطا کیا ہے۔ حالاں کہ نظیر اکبر آبادی اور چند دوسرے شعرا کے یہاں بھی مظاہر قدرت کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن جو آب و تاب اقبال کے یہاں نظر آتی ہے وہ کہیں اور نہیں دکھائی دیتی۔ پروفیسر عبدالمغنی نے اقبال کی فطرت نگاری پر خصوصی طور پر دو مضامین لکھے ہیں جو ''فروغ تنقید'' اور ''اقبال کا نظام فن'' میں شامل ہیں۔ دونوں مضامین میں اقبال کی فطرت نگاری کے تعلق سے پروفیسر عبدالمغنی نے تفصیلی گفتگو کی ہے، اور ان کی

بعض نظموں کے اشعار پیش کر کے اس کی تشریح بھی پیش کی ہے اور اقبال کی فطرت نگاری کے بلند مرتبے کو بتایا ہے۔ اقبال کی فطرت نگاری کے حوالے سے پروفیسر عبدالمغنی کی گفتگو پر اظہارِ خیال سے قبل ان کا یہ اقتباس نقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

> ''اقبال فطرت کے پجاری نہیں تھے، نہ ان کا مطمح نظر ایک شاعر فطرت ہونا تھا۔ لیکن قدرتی مناظر سے انھیں محبت تھی اور وہ حسن فطرت کے شیدا تھے۔ مظاہر فطرت درحقیقت اقبال کے لیے حسن ازل کی نمود تھے اور آفاق میں آیات الٰہی کا درجہ رکھتے تھے۔ بہر حال فطرت سے شاعر کی وابستگی بہت والہانہ تھی اور نہ صرف یہ کہ بہ کثرت نظموں اور اشعار میں اس نے قدرتی مناظر کو اپنا موضوع سخن بنایا بلکہ بے شمار تشبیہات و استعارات اس نے فطرت کے جلووں سے ترکیب دیے۔ اقبال کی متعدد نظموں کا پس منظر بھی فطرت کے مظاہر سے مرتب ہوتا ہے اور بسا اوقات بڑے ڈرامائی طریقے سے ان کے کلام میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس طرح مناظر قدرت اقبال کے تخیلات کی ترسیل کے وسائل بن جاتے ہیں۔ بلاشبہ کلام اقبال کے جادو کا ایک عنصر ان کی شاعری میں جا بہ جا فطرت کی خوب صورتی کے اشارات ہیں''۔(6)

پروفیسر عبدالمغنی کے مندرجہ بالا اقوال کے مطابق اتنا تو صاف ہو جاتا ہے کہ وہ اقبال فطرت کا شیدا تو مانتے ہیں لیکن فطرت کا پجاری نہیں مانتے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اقبال کو وطن دوست مانتے ہیں لیکن وطن پرست نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک پسندیدگی الگ ہے اور پرستی الگ اور اس تضاد کو وہ سختی سے نہ صرف مانتے ہیں بلکہ اوروں کو بھی ماننے پر اکساتے ہیں بلکہ مجبور کرتے ہیں۔

اقبال کی شاعری کی کی جو پہلی بڑی خوبی ہے وہ مظاہر فطرت ہی کی عکاسی ہے۔ اس کے استعمال کے بغیر ان کا فلسفہ منطقی جواز فراہم کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ انھوں نے مظاہر فطرت کے ذریعہ ہی ایک ایسی شمع جلائی جو کٹیا سے نکل کر ایک بڑے خطے کو روشن کرنے لگی اور اس کی روشنی میں نہ صرف حق و باطل کا امتیاز کیا جانے لگا بلکہ اس شمع کی لو نے حرارت بخشی اور بڑی بڑی قربانی کے لیے لوگ تیار ہو گئے اور انہیں کامیابی بھی ملی۔ تحریک جنگ آزادی کی

مثال دیکھ لیجیے ۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

کس طرح وطن عزیزی کی آزادی کے لیے لوگ تیار ہوئے اور بے مثال قربانیاں دے کر کامیابی حاصل کی ۔اقبال کا شعری شعور اتنا بالیدہ تھا اور وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ جو گفتگو مظاہر فطرت سے شروع ہوگی ،اس کی جانب لوگ متوجہ ہوں گے اور پھر آخر میں وہ اپنا مقصد بھی بیان کر دیں گے اور انھوں نے کئی نظموں میں ایسا ہی کیا ہے۔ مظاہر فطرت کے نمونے کے طور پر چند نظموں کے اشعار پیش کیے جا رہے ہیں جن سے اقبال کی فطرت نگاری اور پروفیسر عبدالمغنی کی تنقید کا صحیح اندازہ کیا جا سکے۔اقبال کی نظم ''ایک آرزو'' کے یہ اشعار ملاحظہ کریں ۔

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو
مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو
سرخی لیے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

اسی نظم میں اقبال اپنے مقصد کی جانب لوٹتے ہیں ۔

راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم
امید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو

بجلی چمک کے ان کو کٹیا مری دکھا دے
جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو
اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو
ہر دردمند دل کو رونا مرا رلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید نہیں جگا دے

اقبال کی نظم ''ایک آرزو'' کے ابتدائی اشعار بہ ظاہر رومانی معلوم ہوتے ہیں اور قارئین بڑی توجہ سے ہمہ تن گوش ہو جاتے ہیں اور جیسے ہی قارئین ہمہ گوش ہوتے ہیں، اقبال اپنا مقصد بیان کر دیتے ہیں۔ظاہر سے اقبال نے اپنے اسی مقصد کے لیے یہ نظم کہی تھی اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

اقبال کی مشہور نظم ''ہمالہ'' میں بھی کچھ اسی طرح کی جستجو نظر آتی ہے۔بند ملاحظہ کریں ؎

لیلیٰ شب کھولتی ہے آ کے جب زلف رسا
دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا
وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا
کانپتا پھرتا ہے کیا رنگ شفق کہسار پر
خوش نما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسا پر

اس خوب صورت اور دلکش بند کے بعد اس نظم کا خاتمہ جس بند پر ہوتا ہے اسے بھی ملاحظہ کریں تا کہ گفتگو میں آسانی ہو ؎

اے ہمالہ داستاں اس وقت کی کوئی سنا
مسکن آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا

داغ جس پر غازۂ رنگ تکلف کا نہ تھا
ہاں دکھادے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

پروفیسر عبدالمغنی ان دونوں نظموں کے اشعار کے حوالے سے اپنے خیالات پیش کرتے ہیں کہ اقبال نے ہمیشہ اپنی نظموں میں اپنے مقاصد کو بڑی خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔''ایک آرزو'' ہو یا ''ہمالہ'' دونوں میں ابتدائی بند مظاہر فطرت کے دلکش نمونے معلوم ہوتے ہیں اور اس میں بظاہر کوئی پیغام یا مقصد نظر نہیں آتا لیکن جیسے ہی نظم اختتام کو پہنچتی ہے، اس میں پیغام اور مقصد دونوں ظاہر ہو جاتے ہیں اور اقبال کو اس میں مہارت حاصل تھا۔ پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

> ''اقبال کا مطمح نظر صرف ایسی اصل حقیقی، صاف ستھری اور ارفع و اعلیٰ زندگی ہے، داغ جس پر غازۂ رنگ تکلف کا نہ تھا۔ اقبال فرانسیسی شاعر بودلیر کی اس گناہ آلودہ متمدن معاشرت کے قائل نہیں جس میں گناہ گاروں اور مجرموں کی عبرت خیز ہمدردانہ تصویر کشی کی تعریف ٹی ایس ایلیٹ نے محض اپنے مبالغہ آمیز اور مغالطہ انگیز درد مسیحیت کے سبب کی ہے۔ اقبال کے نظریہ حیات پر مبنی مثالی تہذیب میں صلیبی کفارہ نہیں، ذاتی عمل کی جزا و سزا کا تصور کارفرما ہے۔ لہٰذا وہ دین فطرت کے نظام میں ایک فطری زندگی کے علم بردار ہیں''۔(7)

پروفیسر عبدالمغنی نے اقبال کی ان دو نظموں کے بند کے حوالے سے جو گفتگو کی ہے، وہ بڑی حق بہ جانب معلوم ہوتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پروفیسر عبدالمغنی نے اس دونوں نظموں کی روح تک رسائی حاصل کر لی ہے۔ آئندہ سطور میں اقبال کی کچھ اور نظموں میں مظاہر فطرت کے نمونے دیکھنے اور پروفیسر عبدالمغنی کی تنقید کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

''لالۂ صحرا'' کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خالی ہے کلیموں سے یہ کوہ و کمر ورنہ
تو شعلۂ سینائی، میں شعلۂ سینائی
تو شاخ سے کیوں پھوٹا، میں شاخ سے کیوں ٹوٹا
اک جذبۂ پیدائی! ایک لذت یکتائی!
اے باد بیابانی مجھ کو بھی عنایت ہو
خاموشی و دل سوزی، سرمستی و رعنائی
ہے گرمی آدم سے ہنگامۂ عالم گرم
سورج بھی تماشائی، تارے بھی تماشائی

''شاہیں'' کے اشعار ملاحظہ کریں ۔

ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری
جواں مرد کی ضربت غازیانہ
جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا یہ اک بہانہ
یہ پورب یہ پچھّم چکوروں کی دنیا
مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

ان دونوں نظموں کے اشعار کے متعلق پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

''''لالۂ صحرا'' اور ''شاہیں'' اقبال کی شاعری کے علامتی نظام میں سب سے نمایاں مظاہر فطرت ہیں اور ان کے وسیلے سے شاعر رنگ و نور، قوت و جرأت اور سخت کوشی و بلند پروازی کے خیالات پیش کرتا ہے''۔(8)

ان دونوں نظموں میں اقبال نے مظاہر فطرت کو نمایاں کرنے کے ساتھ جو پیغام دیا ہے، اس کی بڑی اہمیت ہے اور اقبال نے صرف اسی پیغام کو مدنظر رکھا۔ اس پیغام میں نہ کسی طرح کا جمود نظر آتا ہے اور نہ ہی کسی طرح کی جارحیت کی کوشش معلوم ہوتی ہے۔

''شمع وشاعر'' کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہوجائے گی
اس طرح ہوگی ترنم آفریں باد بہار
نکہت خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک
بزم گل کی ہم نفس باد صبا ہو جائے گی
شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی

''تصویر درد'' کے ابتدائی اشعار میں بھی مظاہر فطرت کی عکاسی دیکھنے کو ملتی ہیں ؎

اٹھائے کچھ ورق لالہ نے، کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری
اڑائی قمریاں نے، طوطیوں نے، عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرز فغاں میری

''گورستان شاہی'' میں بھی فطرت کے نظارے دیکھے جاسکتے ہیں ؎

آسماں بادل کا پہنے خرقۂ دیرینہ ہے
کچھ مکدر سا جبین ماہ کا آئینہ ہے

چاندنی پھیلی ہے اس نظارۂ خاموش میں
صبح صادق ہو رہی ہے رات کی آغوش میں
کس قدر اشجار کی حیرت فزا ہے خامشی
بہ ربط قدرت کی دھیمی سی نوا ہے خامشی
باطن ہر ذرہ عالم کا سراپا درد ہے
اور خاموشی لب ہستی پہ آہ سرد ہے

''شکوہ'' جیسی مشہور فکری نظم میں بھی قدرتی مناظر ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں ۔

قمریاں شاخ صنوبر سے گریزاں بھی ہوئیں
پتیاں پھول کی جھڑ جھڑ کے پرشیاں بھی ہوئیں
وہ پرانی روکے روشیں باغ کی ویراں بھی ہوئیں
ڈالیاں پیرہن برگ سے عریاں بھی ہوئی
قید موسم سے طبیعت رہی آزاد اس کی
کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اس کی

ان نظموں کے علاوہ اقبال کی چند دوسری چھوٹی نظموں اور رباعیوں میں بھی فطرت کے نظارے خوبی کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ غزلوں میں بھی ان کے یہاں فطرت کی رنگارنگی نظر آتی ہے۔ چند مثالیں ان کی غزلوں سے بھی ملاحظہ ہوں ۔

گلزار ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

پھر باد بہار آئی، اقبال غزل خواں ہو
غنچہ ہے اگر گل ہو! گل ہے تو گلستاں ہو

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن

برگ گل پر رکھ گئی سبنم کا موتی باد صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن

ترا بحر پرسکوں ہے! یہ سکوں ہے یا فسوں ہے؟
نہ نہنگ ہے نہ طوفاں، نہ خرابی کنارہ

نظر آئے گا اسی کو یہ جہان دوش و فردا
جسے آ گئی میسر مری شوخی نظارہ

یہ کائنات چھپاتی نہیں ضمیر اپنا
کہ ذرہ ذرہ میں ہے ذوق آشکارائی!

کچھ اور ہی نظر آتا ہے کاروبار جہاں
نگاہ شوق اگر ہو شریک بینائی!

چمن میں رخت گل شبنم سے تر ہے
سمن ہے، سبزہ ہے، باد سحر ہے

مگر ہنگامہ ہو سکتا نہیں گرم
یہاں کا لالہ بے سوز جگر ہے

کبھی دریا سے مثل موج ابھر کر
کبھی دریا کے سینے میں اتر کر

کبھی دریا کے ساحل سے گزر کر
مقام اپنی خودی کا فاش تر کر

اقبال کی نظموں اورغزلوں کے پیش کردہ اشعار کے بعد پروفیسرعبدالمغنی کے دواقتباسات پیش کیے جارہے ہیں۔
پروفیسرعبدالمغنی لکھتے ہیں:

''اقبال کی وسیع وعمیق فطرت نگاری کے اس تجزیے سے واضح ہوتا ہے کہ وہ انسانیت کے بلندتر مقام سے مناظر فطرت کا مطالعہ کسی رومانی حسن کاری اور پرستاری کے لیےنہیں کرتے۔ان کا مطمح نظر فطرت کی قوتوں سے کام لے کر حیات وکائنات کی تزئین وترقی ہے۔وہ آفاق میں پھیلیے ہوئے مظاہر فطرت کو قدرت الٰہی کا ایک عطیہ بھی''۔(9)

''اقبال کی فطرت نگاری کا یہ رنگ وآہنگ ورڈز ورتھ کی فطرت پرستی پر ایک اضافہ

> ہی نہیں۔اس میں ایک بہتر تبدیلی،اوراس کا ترفع اوراس کی ترقی صحیح سمت میں ہے۔
> جب کہ حسن فطرت کے وہ سارے جلوے اقبال کی شاعری میں بہ درجۂ کمال موجود
> ہیں جو کسی بڑے سے بڑے رومانی فطرت نگار کے کلام میں ہو سکتے ہیں''۔(10)

اقبال کی کچھ مشہور و معروف نظموں کے کچھ بند اور غزلوں کے کچھ اشعار درج بالا سطور میں پیش کیے گئے ہیں۔ حالاں کہ یہ انتخاب مختصر ہے لیکن اس میں ایک یہ کوشش کی گئی ہے کہ مظاہر فطرت کے چند اچھے نمونے ضرور پیش کر دیئے جائیں اور پروفیسر عبدالمغنی کی تنقیدی رائے جائزہ لیا جائے کہ پروفیسر عبدالمغنی نے اقبال کے ان مظاہر فطرت سے مزین اشعار کو کس طور پر سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

اقبال کے یہاں جس قدر اور جس طرح مظاہر فطرت کی رونمائی ملتی ہے۔ پوری اردو شاعری میں اس کی دوسری مثال نہیں ہے۔ اقبال نے اپنی ان نظموں میں جن کے شعرا کو پیش کیے ہیں۔ ان میں فطرت کے مظاہرے اور قدرتی مناظر کی منظر کشی کی ہے لیکن اپنے مقصد سے بالکل غافل نہیں ہوئے اور بڑی ہی خوش اسلوبی سے نظم کے اختتام سے قبل دو چار مصرعوں میں اپنا مقصد بیان کر دیا۔ وہی مقصد جس کے لیے نظم شروع کی گئی تھی۔ پروفیسر عبد المغنی نے بھی یہ بات تسلیم کی ہے کہ اقبال اپنے مقصد سے بالکل غافل نہیں تھے اور ہزار مناظر فطرت کے قصیدے سناتے سناتے انھوں نے بات کہنے میں بڑی ہنر مندی سے کام لیا ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی نے اقبال کے تعلق سے یہ بھی بتایا ہے کہ فطرت نگاری ان کی شاعری کا مضبوط پہلو ہے اور جس کی بنیاد پر اقبال نے اپنی شاعری کی بنیاد رکھی۔ پروفیسر عبدالمغنی کا شمار اقبال کے مداحوں میں کیا جاتا ہے لیکن جہاں تک ان کی شاعری پر لکھنے کا سوال ہے وہاں وہ بالکل منطقی توجیہ پیش کرتے ہیں اور حتی الامکان کوشش کرتے ہیں کہ اپنے قارئین کو مطمئن کر دیں۔ پروفیسر عبدالمغنی بڑی تفصیل سے لکھنے کے قائل ہیں اور اس وجہ سے کئی باتیں ان کے ذریعہ دہرائی بھی گئی ہیں۔ تفصیل سے لکھنے کے باوجود وہ اپنی تحریروں میں کسی کا کوئی اقتباس نقل نہیں کرتے ہیں۔ اچھا تو یہی ہوتا کہ وہ دوسروں کے اقتباسات بھی نقل کرتے اور پھر ان اقتباسات کی روشنی میں اپنی تفصیلی رائے پیش کرتے۔ ادب میں کسی کی رائے سے متفق ہونا یا نہ ہونا اپنی صواب دید پر ہے۔ یہ میدان عمل کی طرح کھلا ہوا ہے اور جو شخص چاہے کسی بھی فن پارہ کے متعلق اپنی رائے پیش کر سکتا ہے۔ وقت بڑا منصف ہے اور مناسب وقت پر مناسب فیصلہ خود بہ خود ہو جاتا ہے۔

اوپر اقبال کی نظموں اور غزلوں سے جو اشعار پیش کیے گئے ہیں ان میں فطرت کی رنگا رنگی کے نمونے خوب خوب ملتے ہیں۔ان کی بعض نظموں کے اشعار اگر چہ بند میں ہیں پھر بھی دو مصرعوں کو الگ کر لیاہ جائے تو مفہوم مکمل ہو جا تا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح غزل کے کسی شعر کو الگ کر دیا جائے تو مفہوم صاف اور مکمل معلوم ہو جا تا ہے۔ بعض ناقدین ادب کی نگاہ میں یہ عیب ہے تو بعض کی نگاہ میں یہ بھی ایک ہنر ہے۔

مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں:

''ہم کو تو کبھی کبھی ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ اقبال فطرتاً غزل گو تھے اور اتنے بڑے نظم نگار ہونے کے باوجود بھی وہ غزل گو ہی رہے اور نظموں میں بھی انھوں نے ایک قسم کی غزل گوئی ہی کی ہے''۔(11)

مجنوں گورکھپوری کا یہ مضمون پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کی مرتب کردہ کتاب ''اقبال بہ حیثیت شاعر'' میں شامل ہے جہاں سے یہ اقتباس نقل کیا گیا ہے۔لیکن یہ مضمون بہت پہلے کا ہے اور اس سے قبل بھی شائع ہوا ہوگا۔ پروفیسر عبدالمغنی کو اقبال سے والہانہ لگاؤ رہا ہے، اس لیے یہ تحریر ان کی نظر میں بھی ضرور آئی ہوگی لیکن انھوں نے اس حوالے سے کچھ نہیں لکھا۔ پروفیسر عبدالمغنی عموماً اقبال کے تعلق سے کسی دوسرے کی رائے کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے ہیں اور یہاں بھی شاید یہی معاملہ معلوم ہوتا ہے۔

اردو شاعری میں فطرت نگاری میں اقبال کا مرتبہ پروفیسر عبدالمغنی کے نزدیک کتنا بلند ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انھوں نے اقبال کا موازنہ مغربی شعراء سے کیا ہے اور سبھوں پر بھی اقبال کو ترجیح دی ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

''احیائے رومانیت کے دوسرے عظیم شعرا مثلاً کولرج، بائرن، شیلی اور کیٹس کی شاعری میں بھی فطرت نگاری کے عناصر نمایاں ہیں۔کولرج تو ابتداً اور ورتھ ورڈ کا شریک کار ہی تھا اور شیلی کیٹس کے مشہور موضوعات شاعری میں علی الترتیب، بادِ مغرب، اسکائی لارک اور عندلیب خزاں، جیسے مظاہر فطرت ہیں۔ جب کہ ان کے علاوہ بھی متعدد عناصرِ قدرت کو ان شعراء نے اپنا موضوع بنایا۔۔۔ عالمی ادب کے اس معیار اور صحیح تنقیدی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو

> اقبال کی شاعری میں بھی فطرت نگاری کو ایک اہم عنصر تسلیم کرنا پڑے گا اور انہیں کامیاب فطرت نگار قرار دینا پڑے گا۔(12)

پروفیسر عبدالمغنی کے اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اقبال کو مغربی شعراء جن کی فطرت نگاری میں اہمیت مسلم ہے۔ان کے ہم پلہ رکھتے ہیں یا رکھنا چاہتے ہیں لیکن آگے چل کر وہ اپنی باتوں کو کچھ اس طرح سے آگے بڑھاتے ہیں کہ فطرت نگاری کے اتنے عمدہ مظاہرے کے بعد بھی اقبال محض فطرت کی عکاسی تک محدود نہیں ہیں بلکہ اقبال فطرت کو وسیع تر مفہوم اور بلند تر نقطۂ نظر کے طور پر دیکھتے ہیں اور جس طرح شیکسپیئر کو اپنی بعض تحریریوں میں فطرت کی منظر کشی کے باوجود شاعر فطرت نہیں کہا جاتا ہے، اسی طرح اقبال کو بھی مظاہر فطرت کے اتنے اچھے نمونے اپنی شاعری میں موتی کی طرح پرونے کے باوجود بھی شاعر فطرت نہیں کہا جانا چاہیے کہ ان کی منزل تو کہیں اور ہے۔

اس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اقبال کی نظمیہ اور غزلیہ شاعری دونوں میں فطرت کی عکاسی اپنے پورے حسن کے ساتھ موجود ہے۔ وہ فطری تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے نغمگی کو متاثر کیے بغیر اپنے مقصد کو بیان کرنے پر قادر ہیں اور اپنے پیغام کو عام کرنے کی پوری قدرت ان کے شعری ہنر میں موجود ہے۔انھوں نے بڑی ہی خوب صورتی سے اسے برتا بھی ہے اور کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

انسان دوستی

انسان دوستی اردو شاعری میں کوئی نئی اصطلاح نہیں ہے۔شاعری کی ابتدا سے عہد حاضر تک کم وبیش تمام شعرا نے اپنی شاعری میں اس اہم موضوع کو برتا ہے کیوں کہ انسان دوستی کے بغیر کوئی فن اعلیٰ درجے کا فن پارہ نہ بن سکتا ہے اور نہ ہی اس میں زندہ رہنے کی قوت پیدا ہو سکتی ہے اور جب اس کے بغیر فن فن پارہ نہیں بن پائے گا تب تو اس میں انسان دوستی کی اہمیت لازم ہے۔ اردو شاعری میں انسان دوستی کا مطلب ہے انسان اور یہ موضوع مستقل ہمارے شعرا کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ انسان کے فرائض کیا ہیں، ان کے روابط کیسے ہیں، قول وفعل میں کوئی تضاد تو نہیں ہے، اخوت اور محبت میں وہ کس درجہ پر فائز ہے۔ نیز اس کی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے کیا کیا جانا چاہیے اور اسے کیسی تربیت یا علم کی ضرورت ہے وغیرہ۔ یوں تو کم وبیش تمام اردو شعرا نے اس حوالے سے اپنے نظریے کی وضاحت کی ہے اور اپنے اشعار سے انسان اور اس کی زندگی کو گلزار بنانے کی کوشش کی ہے بعض شعراء جس میں ترقی

پسند شعرا کو قدرے امتیاز حاصل ہے لیکن اس معاملے میں اقبال کے یہاں جو نمایاں کوشش نظر آتی ہے وہ دوسرے شعرا کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ اقبال کی پوری شاعری میں انسانیت کے فروغ اور اس کی اصلاح کے لیے بڑی حسین، معنی خیز اور پر لطف کوشش موجود ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری میں انسان کی بقا کے لیے جو خوبیاں ان میں گنوائی ہیں اگر انسان خود کو اس سانچے میں ڈھال لے تو وہ ایک ایسی کرشمائی شخصیت بن جائے گا جس کے چہار طرف رعنائی و زیبائی رقص کرے گی۔ چند اشعار ملاحظہ کریں:

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے
عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری نہ ناری ہے

بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہہ محراب

جس نے سورج کی شعاؤں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

ہوس نے کر دیا ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا

ان اشعار کی روشنی میں اقبال کی انسان دوستی دیکھی جاسکتی ہے کہ اقبال نے حضرت انسان کے لیے کیا پیمانہ مقرر کیا ہے اور آج کا انسان اس پیمانے سے کتنا دور اور کس قدر مختلف ہے۔ اب پروفیسر عبدالمغنی کی تنقید کا جائزہ لیں گے کہ وہ اقبال کی انسان دوستی کو کس نظریے سے دیکھتے ہیں۔ پروفیسر عبدالمغنی اقبال کی انسان دوستی کو ان کی شاعری کا اہم سرمایہ قرار دیتے ہیں۔ وہ اقبال کی انسان دوستی کو اسلام سے قریب بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اقبال کے نزدیک کائنات وحیات کسی حیوانی ارتقاء کا نتیجہ نہیں بلکہ سراسر ایک الوہی تخلیق ہے۔ پوری کائنات کا خالق ایک باشعور اور بااختیار ہستی ہے، اور پوری نوع انسانی ایک مرد اور ایک عورت کی اولاد ہے، اور حیات انسانی کا ایک واضح مقصد ہے، جس کی تکمیل کے لیے ہی پورا نگارخانۂ ہستی سجایا گیا ہے، اور اس تعمیل کے لیے خالق ہستی نے خود ایک ضابطہ، ایک نظام تجویز کیا ہے اور اس کا نام بھی خود اس نے اسلام رکھا ہے''۔(13)

پروفیسر عبدالمغنی کے مندرجہ بالا اقتباس کا یہ مفہوم نکالا جاسکتا ہے کہ اسلام صرف ایک مذہب نہیں بلکہ مکمل دین ہے اور سب سے پہلے اسی نے انسان دوستی یا انسانیت کی بقا کے لیے واضح لائحۂ عمل دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اور اس کا واحد حل اسلام ہی میں ہے تو بات کچھ زیادہ سخت ہو جائے گی۔ اسلام نے انسانیت کا جو درس دیا ہے اس کی افادیت سے انکار ممکن نہیں لیکن انسانیت کا درس تو دیگر مذاہب میں بھی ملتا ہے۔ اسلام میں یہ پہلو کچھ زیادہ ہی نمایاں ہوا ہے اور اس کی اس اہمیت کو اسلام کے منکر بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے مطابق اقبال نے اپنی شاعری میں جو انسان دوستی کی اصطلاح قائم کی ہے اور اسے جو فلسفیانہ رنگ عطا کیا ہے وہ اسلام ہی کا مرہون منت ہے، گویا انھوں نے وہیں سے روشنی حاصل کی ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی یہاں حق بہ جانب ہیں۔ واقعی اقبال نے اسلام ہی سے انسان دوستی کی روشنی حاصل کی ہے اور اسے بہتر طور سے پیش کیا ہے بلکہ پوری اردو شاعری میں مجموعی طور پر انسان دوستی کے فروغ کی جتنی کوششیں ہوئی ہیں وہ ایک طرف اور اقبال کی کوشش دوسری طرف رکھی جائے تو بھی اقبال کی کوشش نمایاں معلوم ہوگی۔

اقبال کی انسان دوستی پوری انسانیت کے لیے ہے۔ مشرق ومغرب ہی نہیں پوری کائنات کے انسانوں کے لیے ان کا پیغام ہے اور ان کے اس پیغام پر عمل کیے بغیر دنیا میں امن وسکون، فلاح و بہبود حتیٰ کہ روشن خیالی بھی نہیں

آسکتی۔ اقبال کی انسان دوستی کے تعلق سے ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

''ان کا فلسفہ صرف فلسفہ ہی نہیں ہے، حیات انسانی کا ایک نظام فکر ہے جس میں انسان دوستی کا خیال بنیادی حقیقت رکھتا ہے''۔(14)

گویا پروفیسر عبدالمغنی کے علاوہ دوسرے ناقدین ادب نے بھی اقبال کی شاعری میں انسان دوستی کے پیغام کو اہم کہا ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی نے بھی بڑے اچھے ڈھنگ سے اس کی وضاحت کی ہے۔ انھوں نے اقبال کی شاعری میں ان کے اس انسان دوستی کے پیغام کو اس کی شاعری کا اہم سرمایہ قرار دیا ہے جو میرے خیال میں حق بہ جانب بھی ہے ۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی باور کرایا ہے کہ اقبال کے مندرجہ بالا شعر کی طرح انسانوں کو بیدار اور تیار رکھنے کی ضرورت ہے۔ تبھی اقبال کی انسان دوستی کا پیغام صحیح معنوں میں اپنے خوب صورت انجام تک پہنچ سکے گا۔

اقبال اور ٹی ایس ایلیٹ

20 ویں صدی کے دو مشہور شعرا اقبال اور ٹی ایس ایلیٹ ہیں اور زندگی کے متعلق دونوں کا نظریہ مذہبی و روحانی ہے۔ ایلیٹ کو شاعر مغرب کہا جاتا ہے، کیوں کہ اس نے عیسائیت کی ترویج و اشاعت کے ساتھ اسے تصور حیات بنا کر پیش کیا ہے۔ جب کہ اقبال کو شاعر مشرق کے خطاب سے نوازا جاتا ہے کیوں کہ انھوں نے اسلام کو دنیا کا سب بہتر تصور حیات بتایا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبال نے جب اسلام کو دنیا کا سب سے بہتر تصور حیات بنا کر پیش کیا ہے تو انہیں شاعر مشرق کیوں کہا جائے۔ ان کی فکر تو سارے عالم کے لیے ہے تو انہیں صرف شاعر مشرق کہہ کر ان کی اہمیت کو کیوں کم کی جائے۔ پروفیسر عبدالمغنی نے اقبال اور ٹی ایس ایلیٹ دونوں کی اہمیت اور افادیت بیان کی ہے اور تفصیل سے جائزہ لیا ہے کہ کہاں اقبال کا فلسفۂ حیات اور ایلیٹ کا فلسفۂ حیات متصادم ہے اور کس وجہ سے ایلیٹ محدود اور اقبال سارے حدود سے آگے نکل گئے ہیں۔ پروفیسر عبدالمغنی بتاتے ہیں کہ ٹی ایس ایلیٹ فلسفہ کا طالب علم تھا لیکن اس کے باوجود اس نے فلسفے کے موضوع پر جو تحقیقی مقالہ لکھا KNOWLEDGE AND

EXPERIENCE IN THE PHILOSOPHY OF F. H. GADLEY اسے کچھ خاص اہمیت حاصل نہین ہوئی جب کہ اقبال نے ''اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیل جدید'' RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM کو علمی حلقوں میں فلسفے کی ایک اہم کتاب سمجھا جاتا ہے۔

اسی طرح اقبال کی فکری پختگی اور ایلیٹ کی ذہنی ناہمواری بھی دونوں کی شاعری کو الگ الگ محور عطا کرتی ہے۔ ایلیٹ کے یہاں مسیحیت غالب تو ہے ہی لیکن ان کی شاعری میں کچھ ایسی باتیں بھی آ گئی ہیں جو مسیحیت میں بھی مفکرانہ سمجھی جاتی ہیں جب کہ اقبال کے یہاں مذہبی رنگ ہونے کے باوجود وہ اپنی پوری شاعری میں آخر تک اصلاح دین کے متقاضی نظر آتے ہیں۔ ایک نمایاں فرق یہ بھی ان دونوں میں نظر آتا ہے کہ ایلیٹ مسیحیت میں خود کو کیتھولک کہتا ہے جو دوسرے فرقے پروٹسٹنٹ کے مقابلے میں زیادہ قدامت پسندی کا قائل ہے، جب کہ اقبال پوری ملت اسلامیہ کو خطاب کرتے ہیں۔

سیاست میں بھی ایلیٹ اور اقبال کا موقف مختلف ہے۔ ایلیٹ جہاں بادشاہی کو پسند کرتا ہے بلکہ بادشاہ پرست ہے، وہیں اقبال ہر طرح کی بادشاہی کے خلاف اور پورے عالم انسانیت کو اخوت ومحبت اور مساوات کا پیغام دیتے ہیں۔ اقبال دین اسلام کو ایک قوم یا کسی خطے، علاقے کے لیے نہیں بلکہ سارے عالم کے لیے نجات بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اقبال اور ٹی ایس ایلیٹ کے متعلق پروفیسر عبدالمغنی کے دو اقتباسات ملاحظہ کریں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ٹی ایس ایلیٹ بھی نجات کے لیے ہوس (DESIRE) کو ترک کے عشق (L O V E) کو اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ اپنے آخر کوارٹٹ LITTLE GIDDING میں ہوس سے آگے بڑھ کر عشق کی توسیع کی بات کرتا ہے مگر اس کا تصور عشق محدود ہے۔ اس میں وہ آفاقی وسعت نہیں جو اقبال کے تصور عشق میں نمایاں ہے۔ اس لیے ایلیٹ کا عشق شخصی وابستگی کا سکون وسکوت ہے جب کہ اقبال کا عشق ایک کائناتی جذبہ کی بے تابی ونغمہ آفرینی ہے''۔(15)

> ''شخص اور فنکار دونوں حیثیتوں سے ایلیٹ اقبال کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتا۔

اس کا علمی وادبی یا فکری وفنی نیز تہذیبی ومعاشرتی قد وقامت نہیں کہ وہ اقبال کے برابر کھڑا ہو سکے۔ اقبال کا موازنہ اگر مغربی ادبیات کے مشاہیر ہوسکتا ہے تو وہ صرف تین شعراء دانتے، شیکسپیئر اور گوئٹے ہیں۔ اقبال دنیا کے عظیم ترین شاعر ہیں اور مذکورہ مغربی شعرا پر بھی فوقیت رکھتے ہیں۔ اقبال کا فن دوسرے کسی شاعر سے زیادہ آفاقی ہے اور ان کی فکر بہت زیادہ وسیع تر، بلند تر اور عمیق تر ہے۔ اقبال کے حیات افروز افکار نے جیسے حسین وجمیل اشعار کی شکل اختیار کی ہے اور ان میں مسرت وبصیرت کا جو کامل امتزاج ہے، اس کی کوئی مثال ادبیات عالم میں موجود نہیں''۔(16)

اس طرح ہم نے دیکھا کہ ایلیٹ اور اقبال کے درمیان فکری سطح پر جو اختلافات ہیں ان کی وجہ سے ایلیٹ کی شاعری میں آفاقی ہونے کے لیے جو خامیاں نظر آتی ہیں وہ اقبال کے یہاں مکمل طور پر موجود ہیں اور اسی لیے اقبال ایلیٹ سے بڑے شاعر بقول پروفیسر عبدالمغنی قرار پاتے ہیں۔

اقبال کے تعلق سے پروفیسر عبدالمغنی ایسی عقیدت رکھتے ہیں کہ اقبال مخالف کوئی فکر ہو یا شخص وہ بڑے ہی جارحانہ انداز میں اپنا موقف پیش کرتے ہیں جب کہ بعض مواقع پر اس طرح کے جارحانہ انداز اختیار کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ ایلیٹ پر تنقید کرتے وقت پروفیسر عبدالمغنی نے اسی طرح کا جارحانہ رویہ اختیار کیا ہے جس کی جھلک ان کے مندرجہ بالا اقتباس میں دیکھی جا سکتی ہے۔ موجودہ عہد میں بھی کئی ناقدین ادب اسی طرح کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کے لیے ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ رویہ محض مخصوص حلقے میں تو شاید پسند کیا جاتا ہو لیکن عمومی طور پر اسے سند اعتبار حاصل نہیں ہوئی اور پھر جب کسی کے لیے اس طرح کا رویہ آپ رکھیں گے تو وہ بھی ہمارے تئیں ایسا ہی رویہ اختیار کرے گا۔ تنقید ادبی پیرائے میں ہی رہے تو ادب اور ادیب دونوں کے لیے بہتر ہے۔

اقبال اور دانتے

دانتے کی مشہور تصنیف ''ڈوائن کامیڈی'' کو مغربی ادبیات میں بڑی مقبولیت وشہرت حاصل ہے اور اقبال کو ''جاوید نامہ'' کی وجہ سے انفرادیت حاصل ہے۔ اس لیے دونوں تصانیف کا موازنہ غیر فطری بھی نہیں ہے۔

معروف نقاد کلیم الدین احمد نے ''جاوید نامہ'' اور ''ڈوائن کامیڈی'' کا موازنہ کیا اور ڈوائن کامیڈی کو جاوید نامہ سے بہتر تصنیف ثابت کیا۔ کلیم الدین احمد نے جو نتائج نکالے ہیں پروفیسر عبدالمغنی قطعی طور اس سے اتفاق نہیں رکھتے اور ان کے خیال میں ''جاوید نامہ''، ''ڈوائن کامیڈی'' سے ہزار درجہ بہتر تصنیف ہے۔ ان دونوں ناقدین ادب کے پیش نظر اجمالی طور پر ان دونوں تصانیف کا جائزہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

دانتے نے اپنی تصنیف ''ڈوائن کامیڈی'' میں دنیا و آخرت کے معاملات کو پیش کیا ہے اور چوں کہ مغربی مفکرین جن میں اکثر اسلام مخالفین رہے ہیں انھوں نے دانتے کی اس تصنیف کو بڑی اہمیت دی ہے، اور اس کو محض کامیڈی کے بجائے ''ڈوائن کامیڈی'' بنا دیا۔ ''ڈوائن کامیڈی'' دراصل ایک تمثیلی نظم ہے جس میں دانتے نے خیالی سفر میں بڑے اہتمام کے ساتھ کلیسا کے گنہگاروں کو سزا اور وفاداروں کو جزا دینے کی داستان سنائی ہے، اور اپنی اس پوری نظم میں جس میں ڈرامے کی کیفیت پائی جاتی ہے، ماہر فلکیات ہونے کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔ کلیم الدین احمد کے خیال میں دانتے نے ڈوائن کامیڈی کا نقشہ مرتب و منظّم اور اپنے وقت کے لحاظ سے حکیمانہ طور پر کیا تھا، اور اس کی تفصیلات بھی منطقی دلائل کے ساتھ پیش کی ہیں۔ کلیم الدین احمد رقم طراز ہیں:

''دانتے نے ایک عالیشان عمارت تعمیر کی ہے جس کی وسعت تحت الثریٰ
عرش معلیٰ تک ہے اور اس کے مختلف حصوں میں تناسب ہے''۔(17)

مختصر یہ ہے کہ کلیم الدین احمد نے ''ڈوائن کامیڈی'' کی شاعری، فکر، استعارے، ڈرامائی کیفیت گویا اس کے تمام پہلوؤں کی تعریف کی ہے اور اقبال کے ''جاوید نامہ'' اسے بہتر قرار دیا ہے، جب کہ پروفیسر عبدالمغنی کلیم الدین احمد سے مختلف رائے رکھتے ہیں۔ واضح ہو کہ اقبال کے معاملے میں کلیم الدین احمد اور پروفیسر عبدالمغنی ایک دوسرے سے متفق نہیں تھے جب کہ کم و بیش دونوں ناقدوں کا زمانہ ایک ہی تھا۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ کلیم الدین احمد نے جہاں جہاں اقبال کی شاعری کی کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے پروفیسر عبدالمغنی نے انھی تمام پہلوؤں کے نئے نکتے نکال کر کلیم الدین احمد کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔

پروفیسر عبدالمغنی کے خیال میں ''جاوید نامہ'' کی بنیاد معراج النبی ﷺ کی بنیاد پر رکھی گئی ہے جو اسلام میں معروف اور مسلم ہے۔ تا کہ اس بنیادی تاریخ سے انحراف کی کوئی گنجائش نہ رہے لیکن اس کے ساتھ ہی اقبال نے یہ

بھی خیال کیا ہے کہ اسے صرف معراج النبی ﷺ تک ہی محدود نہ رکھا جائے۔ بلکہ اس کے ذریعہ حیات وکائنات کے اہم مسائل پر بھی اظہار خیال کی جائے اور اس کوشش میں خیال پر کسی طرح کی کوئی بندش نہ رہی اور انھوں نے اپنی تخیلات کو آزاد چھوڑ دیا۔کہیں منظرکشی تو کہیں کردار نگاری نظر آتی ہے۔ مجموعی طور پر دیکھیں تو ''جاوید نامہ'' اقبال نے جس مقصد کے تحت لکھا تھا۔ وہ اس میں پوری طرح سے کامیاب رہے ہیں۔ پروفیسر عبدالمغنی رقم طراز ہیں:

'''' ''جاوید نامہ'' کی منصوبہ اپنی جگہ بالکل مرتب، مربوط اور منظّم ہے اور جس مقصد کے لیے عالم جاوید کی طرف شاعر نے پرواز کی تھی وہ اس سے پورا ہو جاتا ہے۔ یہ ہر جہت سے ایک کامیاب، موثر، عظیم الشان اور ادبیات عالم میں فقید المثال تخلیق شاعری ہے۔ اس میں نہ صرف اقبال اپنے عروج پر ہیں بلکہ یہ مشرقی شاعری کا نکتۂ کمال اور عالمی ادب کی معراج ہے''۔(18)

''جاوید نامہ'' کے خلائی سفر کا نقشہ پیش کر کے اقبال جن منصوبوں پر کام کرنا چاہتے تھے، اس میں انھیں کامیابی ملی اور انھوں نے دنیا کو بتایا کہ تحلیل کی روشنی اگر حاصل ہو جائے تو حیات وکائنات کے اہم اور بنیادی مسائل پر اس طرح بھی اظہار خیال کیا جا سکتا ہے۔ اقبال روئے زمین پر بسنے والے انسانوں کے لیے جو ہدایتیں لانا چاہتے تھے، انھیں اس میں بھی کامیابی ملی ہے۔ اس میں منظرکشی بھی ہے، شعریت بھی ہے، کردار سازی بھی ہے، مکالمہ کا بھی خیال رکھا گیا ہے اور قصہ گوئی بھی خاطر خواہ ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پروفیسر عبدالمغنی جو دانتے کے ''ڈوائن کومیڈی'' سے بہتر ''جاوید نامہ'' کو سمجھتے ہیں اس میں وہ حق بجانب ہیں اور کلیم الدین احمد کا اعتراض برائے اعتراض ہے۔

اقبال اور ملٹن

ملٹن نے ''شیطان کی مجلس شوریٰ'' لکھی اقبال نے ''ابلیس کی مجلس شوریٰ''۔ جب دو بڑے شعرا ایک ہی موضوع پر لکیں گے جو موضوع اور مواد کے اعتبار سے بھی یکساں ہو تو موازنہ فطری ہو جاتا ہے۔ کلیم الدین احمد نے دونوں نظموں کا موازنہ نہ کیا اور کم وبیش یک طرفہ فیصلہ ملٹن کے حق میں سنا دیا۔ کلیم الدین احمد لکھتے ہیں:

'''' ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کا ''شیطان کی مجلس شوریٰ'' سے مقابلہ ایک قسم کی

تنقیدی بدمزاجی اور بے راہ روی ہے۔ ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں نہ تو کوئی پس منظر ہے اور نہ کسی مشیر کی شخصیت اور نہ صورت صاف ابھرتی ہے، یہاں تک کہ ابلیس کی بھی شخصیت اور صورت پر پردہ ڈال دیتے ہیں لیکن ملٹن کے ''شیطان کی مجلس شوریٰ'' میں ایک شاعرانہ مرعوب کن پس منظر ہے۔ پھر شیطان ہم دیکھتے ہیں اور اس کی شخصیت بھی ہم پر اثر انداز ہوتی ہے۔۔۔ اقبال کی نظم میں صرف الفاظ الفاظ اور الفاظ ہیں''۔(19)

کلیم الدین احمد کی اس سخت تنقید کے بعد پروفیسر عبدالمغنی اقبال کی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کے تعلق سے اظہار خیال کرتے ہوئے کلیم الدین احمد کی رائے کو یکسر رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' ایک تمثیلی نظم ہے جو بے حد کامیاب پر اثر اور فکر انگیز ہے۔ اس نظم کا موضوع نہ تو ابلیس کی شخصیت وصورت کی نقاشی ہے نہ اس کے مشیروں کی۔ گرچہ یہ ضرور ہے کہ موضوع کے اعتبار سے نظم کے کرداروں کی نوعیت کا لحاظ کیا گیا۔ خاص کر ابلیس کے متعلق جو اقبال کا تخیل ہے اس کے مطابق ابلیس کے بیانات درج کیے گئے ہیں۔ ابلیس کا استعمال اقبال نے اکثر خیروشر کی تاریخی کشمکش میں ایک علامت کے طور پر کیا ہے چناں چہ اس نظم میں بھی حالات حاضرہ پر ایک مخصوص زاویہ نگاہ سے تبصرہ مقصود ہے اور ابلیس کو منفی طور پر اسی زاویہ نگاہ کا ترجمان بنایا گیا ہے جب کہ اس کے مشیروں کی حیثیت اس ترجمانی میں معاون کی ہے۔ دیوتاؤں کی جنگ کی کوئی نامعقول خرافات نہیں ہے۔ دور حاضر کی مختلف نظریاتی قوتوں کی کشمکش کے حقائق پیش کیے گئے اور مستقبل کے بارے میں چند پیغمبرانہ PROPHETIC اشارے کیے گئے ہیں۔ یہ نظم 1936ء میں اقبال نے اپنی موت سے دو اور جنگ عظیم ثانی سے تین سال قبل کہی تھی۔ اسی زمانے میں عالمی طاقتوں کے مقابلے اور مقابلے کی حقیقت کی اس سے بہتر تصویرکشی دنیا کے کسی شاعر نے نہیں کی ہے، اور نہ کرسکتا تھا۔ اول تو کسی شاعر کو یہ بصیرت ہی حاصل نہیں تھی کہ وہ احوال زمانہ کا ایسا سچا مطالعہ کر سکے، دوسرے یہ کہ اقبال کے سوا دنیا کے کسی شاعر کی بس کی بات نہیں

کہ الٰہیات، تاریخ، فلسفہ او رسیاست کو انتہائی خوب صورتی کے ساتھ ترتیب دے کر زندگی کے سخت ترین حقائق کو لطیف ترین شاعری میں ڈھال سکے‘‘۔(20)

مذکورہ اقتباس کچھ طویل ضرور ہے لیکن صورت حال کے لحاظ سے ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔اس اقتباس سے نظم کی ہیئت،فکراور موضوع کے ساتھ وہ ساری تفصیلات معلوم ہو جاتی ہیں جس کے لیے کئی صفحات کی ورق گردانی کی ضرورت ہوتی۔ پروفیسر عبدالمغنی کے اس اقتباس کے بعد کلیم الدین احمد کے تاثرات یا عقلی دلائل غیر مناسب معلوم ہوتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ملٹن کی نظم ’’شیطان کی مجلس شوریٰ‘‘ کو خواہ مخواہ ہی انھوں نے اتنی اہمیت دی ہے جب کہ اقبال کی نظم زیادہ بااثر، بامعنی اور عہد حاضر کے تمام تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔اقبال کی نظم ’’ابلیس کی مجلس شوریٰ‘‘ سے دو اشعار پیش کیے جارہے ہیں۔جن میں سیاسی بصیرت اور دانشورانہ گیرائی صاف محسوس کی جاسکتی ہے۔

کاروبار شہر یاری کی حقیقت اور ہے
یہ وجود میر و سلطاں پر نہیں ہے منحصر
مجلس ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو
یہ ہے سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر

اقبال اور نظریۂ خودی

اقبال کی شاعری کا ایک اہم جز ان کا نظریۂ خودی ہے۔نظریۂ خودی نے اقبال کو ایک طرح کی انفرادیت عطا کی ہے جو انھیں دوسرے شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ اقبال کی خودی پر ماہرین اقبال سے لے کر دیگر ناقدین حضرات نے بھی مختلف رنگ اور پہلو سے اقبال کی خودی پر بحث کیا ہے۔ان تمام سے صرفِ نظر ہم، پروفیسر عبدالمغنی نے جو نظریۂ خودی پر بحث کی ہے اس پر اپنی نظر مرکوز کرتا ہوں۔ اقبال کے نظریۂ خودی پر پروفیسر عبد المغنی نے 544 صفحات پر مکمل کتاب ’’اقبال کا نظریۂ خودی‘‘ کے عنوان سے لکھی ہے۔اس کتاب میں انھوں نے بڑی تفصیل سے خودی کے اسرار و رموز کو کھول کر بیان کیا ہے اور کلام اقبال کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی ہے کہ خودی کے بغیر

انسان، معاشرہ، مت اور قوم ایسی ہے جیسے کسی پر بے حسی طاری ہو جائے اور وہ کچھ کرنے کے بجائے دوسروں کی مدد کا خواہاں بنا رہے۔ خودی کے تعلق سے پہلے پروفیسر عبدالمغنی کی چند مختصر آراء ملاحظہ کرلیں تاکہ اظہار خیال اور گفتگو کو نتیجہ خیز بنانے میں آسانی ہو:

''دراصل خودی ایک بہت سادہ سی فطری چیز ہے جسے ہم بہ آسانی عرفان ذات کہہ سکتے ہیں''۔(21)

''صحیح شعور ذات کے ساتھ تعمیری سرگرمی ہی خودی کا اصل مطمح نظر ہے''۔(22)

''خالق ومخلوق کا ارتباط ہی خودی وخدا کا معاملہ ہے، خدا کا منکر درحقیقت خودی سے بہرہ ورنہیں ہوتا''۔(23)

''خودی کا مرکز بہرحال انسان کی ذات اس کا استقلال واستحکام ہے۔فرد اپنے شعور وکردار ہی کی بدولت سماج اور خدا دونوں سے اپنے رشتے قائم کرتا ہے''۔(24)

''اقبال کا پیغام حیات خودی اپنے وسیع تر معنوں میں ہے اور اس کی بنیاد خدا کی ذات ہے جو خودی کی تمام جہتوں کا منبع ہے''۔(25)

''مختصر یہ کہ خودی کا نقشۂ اول بھی خدا ہے اور نقشۂ آخر بھی خدا ہے''۔(26)

پروفیسر عبدالمغنی کے مندرجہ بالا چند مختصر اور اہم اقتباسات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اقبال کی شاعری میں خودی کو کیا مقام حاصل ہے اور خودی کے ذریعہ اقبال کون سا اچھا عمل پوری انسانیت کے نام کرنا چاہتے تھے انسان سب سے پہلے اپنے اندر نا صرف جھانک کر دیکھے بلکہ دل میں اتر جائے اور جب اسے اپنی خبر ہو جائے تو عرفان ذات کہا جاتا ہے تو پھر اس کے آگے کی راہ زیادہ دشوار نہیں ہے۔خودی انسان کو خدا کے قریب کرنے والی راہ ہے۔جس راہ پر چل کر وہ اپنے مالک حقیقی تک پہنچ سکتا ہے۔

خودی سماج ومعاشرہ بلکہ پوری انسانیت میں نظم وضبط قائم کرنے کے لیے ضروری ہے، کیوں کہ خودی کے بغیر کسی طرح کے شر اور خرافات کا مقابلہ ممکن نہیں، کیوں کہ غیر کی راہ پر چلنے والے ہمیشہ کم ہوتے ہیں اور ان میں بھی خودی نہ تو وہ شر اور خرافات کا کس طرح مقابلہ کر پائیں گے ۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

ملت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

غافل نہ ہو خودی سے کر اپنی پاسبانی
شاید کسی حرم کا تو بھی ہے آستانہ

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق

خودی سے یہ بھی مراد لیا جاتا ہے کہ جو ہو چکا ہے وہ تمہاری تقدیر تھی لیکن جو ہو رہا ہے اسے تم اپنی تدبیر سے بدل سکتے ہو اور تبھی تمھارا آنے والا کل خوش گوار ہوگا۔ اس طرح زندگی بسر کرنے والا چاہے تو اپنی دین و دنیا دونوں سنوار لے۔ جستجو کی اس منزل سے آگے بڑھنے کے بعد وہ اپنے معاشرے، سماج، قوم اور پوری انسانیت کے لیے نہ صرف مثال بنتا ہے بلکہ نجات کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔ وہ خود کو تبدیل کرتا ہے۔ اور پھر اس کے نقشِ قدم پر چل کر دوسرے بھی میدان عمل آ جاتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ کارواں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ خودی کا اندازہ وہی کر

سکتا ہے جسے عرفان ذات ہو چکا ہو۔

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیر ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے
نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر
نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتش ناک

حیات و موت نہیں التفات کے لائق
فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوق پرواز ہے زندگی

جیسا کہ درج بالا اقتباس میں پروفیسر عبدالمغنی کہتے ہیں کہ خودی کا نقطۂ اول بھی خدا ہے اور نقطۂ آخر بھی وہی خدا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کے اختیار میں بہت کچھ ہے اور وہ اپنی راہ منتخب کر سکتا ہے۔ وہ راہِ خدا اپنا لے یا پھر زمانے کا پابند ہو جائے۔

یہ بندگی خدائی، وہ بندگی گدائی
یا بندۂ خدا بن، یا بندۂ زمانہ

پروفیسر عبدالمغنی خودی کے فروغ کے لیے خود داری کو ضروری شرط مانتے ہیں جس کے بغیر خودی نہ تو موثر ہو سکتی ہے اور نہ تو معتبر ہو سکتی ہے۔ خواہ وہ خودی کی ہو، فرد کی ہو یا جماعت کی، تنگدستی، ناداری اور محتاجی انسان کو کہیں کا نہیں رکھتی اور انسان دوسرے کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھتا اور اپنی تقدیر کو کوستا رہتا ہے۔ اس لیے خودی کے لیے خود داری بہت اہم ہے۔ کیوں کہ جب تک خودداری نہیں ہوگی وہ قناعت پسند نہیں ہوگا اور قناعت پسندی خودی کے لیے ضروری ہے۔ گویا خودی ہاتھ آ جائے تو پھر دنیا کا نقشہ ہی بدل جائے اقبال کا اپنے اشعار میں اسلامی واقعات کے

ذریعے پوری انسانیت خصوصاً اہل اسلام کو یہ پیغام دیا ہے کہ خودی کی راہ خدا تک پہنچتی ہے۔ لہذا اس پر راہ پر چل کر ہی دونوں جہاں سنواری جاسکتی ہے اور مستقبل کے لیے بھی کوئی ایسا لائحہ عمل تیار کیا جاسکتا ہے جو آنے والی نسلوں کے لیے سودمند ہو۔ اس لیے انھوں نے مرد کامل یا مرمومن کی اصطلاح پیش کی ہے۔ اقبال کی خودی مردمومن یا مرد کامل اصطلاح کی پیش نظر وقار عظیم لکھتے ہیں:

> ''اقبال نے اپنی مثالی دنیا کے لیے جس مردمومن کا تصور دیا ہے اس کی صفات وہی ہیں جو مرد کامل کی ہیں۔ اس تصور کی تخلیق وتعمیر میں تعلیمات قرآن نے اقبال کی رہنمائی کی ہے۔ ان کے نزدیک فرد کی جملہ صلاحیتوں کے اظہار کے لیے کسی ایسے معاشرے، ایسے قانون نظام کا وجود ضروری ہے جو فرد کو ایسے مواقع فراہم کرا سکے کہ وہ اپنی آزادی سے اپنی فطری صلاحیتوں سے کام لے اور پھر یہ صلاحیتیں نمایاں ہو کر ترقی کی منزلیں طے کر کے فرد کی شخصیت میں مکمل ہم آہنگی پیدا کر سکیں۔ فطری صلاحیتوں کی اس ہم آہنگی کا نام خودی کی تکمیل اور معراج ہے جو انسان کو انسان کامل اور اقبال کی اصطلاح میں مردمومن بناتی ہے''۔(27)

وقار عظیم نے اقبال کے مرد کامل کو مردمومن بنانے کے لیے خوش گوار اور مناسب حالات کو بھی تسلیم لیا ہے اور اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اقبال جس خودی کے سہارے مرد کامل یا مردمومن کی بات کر رہے ہیں وہ تو حالات خود اپنے موافق بنائیں گے اور ظاہر ہے کہ جو اپنے موافق حالات نہ بدل سکے وہ کوئی بڑا کارنامہ کیا انجام دے سکتا ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے ادھر نکلے، ادھر ڈوبے ادھر نکلے

نگہہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے

اقبال کے نظریۂ خودی کے تعلق سے پروفیسر عبدالمغنی نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے کہ اقبال نے خودی کی ضرورت کیوں محسوس کی اوراس خودی کا سرا کہاں جا کر ملتا ہے۔خودی ہی مرد کامل اور مرد مومن بناتی ہے۔اس طرح اقبال خودی کے تعلق سے زمانے میں جو پیغام دینا چاہتے تھےاوران کا جومقصد تھا، بھلے ہی انہیں اس میں کامیابی نہ ملی ہولیکن خودی کی اصطلاح جوانھوں نے وضع کی ہے اسے اردوشاعری میں بے حد اہمیت حاصل ہے۔

اقبال اوران کی شاعری کے بارے میں پروفیسر عبدالمغنی کے تنقیدی خیالات آپ نے ملاحظ کیے۔مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے اقبال کو عالمی ادب میں سب سے نمایاں کر کے پیش کیا ہےاور بڑی جسارت کے ساتھ یہ بات کہی ہے کہ کسی زبان میں ایسی شاعری نہیں ہے جو اقبال کی شاعری کے ہم پلہ کہی جا سکے۔انھوں نے اپنے اس دعوے کو لیل کے ذریعہ پیش بھی کیا ہے۔ذیل میں دیکھتے ہیں کہ عالمی ادب میں اقبال کا کیا مقام ہےاور پروفیسر عبد المغنی کے اس دعوے میں کتنی صداقت ہے۔

عالمی ادب میں اقبال کا مقام

پروفیسر عبدالمغنی نے صحیح بات کہی ہے کہ اقبال کا مقام عالمی ادب میں طے کرنے سے قبل یہ جاننا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اب تک مشرقی ومغربی ادب کا کس سطح پر موازنہ ہوا ہےاور یہ موازنہ کس نے کیا ہے۔اول تو ان کا کہنا ہے کہ تقابلی جائزہ لیا ہی نہیں گیا اور کسی نے جائزہ لیا بھی ہے تو وہ اس سطح کے نہیں ہیں جن پر گفتگو کی جا سکے۔ان کا ناقدوں پر یہ بھی الزام ہے کہ ان پر مغربی ادب اور مغربی ترجیحات کی مرعوبیت ایسی طاری ہے کہہ وہ مغربی ادب کے ساتھ مشرقی ادب کے موازنہ کی جسارت نہیں کر سکے۔مغربی ناقدوں کا معاملہ تو یہ ہے کہ انھوں نے مشرقی ادب کو اس لائق ہی نہیں سمجھا کہ اس کے حوالے بھی اپنی کتابوں میں دیں۔مغربی نقادوں کے اس ادبی تصور میں اہل مشرق نے خوب خوب ساتھ دیا ہےاوراس وجہ سے مغربی ادب میں اہل مشرق کے ادبی حوالے نہیں کے برابر ہیں۔

پروفیسر عبدالمغنی کے یہ دلائل حق بجانب معلوم ہوتے ہیں۔اہل مشرق خود اتنے خانوں میں منقسم ہیں کہ

انھیں اپنے ہی ادب میں اپنی دھاک جمانے کے لیے کسرت کرنی پڑ رہی ہے۔ ایسے میں انھیں اتنی فرصت کہاں ہے کہ وہ مغربی ادب کے بارے میں خیال کریں۔

پروفیسر عبدالمغنی کہتے ہیں کہ اقبال کے زمانے میں جو مسائل انہیں ملے وہ دوسری طرح کے تھے اور ان سے قبل جن شعرا کا موازنہ ان سے کیا جاتا ہے، ان کے مسائل الگ تھے۔ اقبال کے زمانے میں نئی سیاست اور معاشرت کی تحریک نے ایک طرح سے پوری دنیا کے نظام کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔ وہ سارے پرانے انداز بدل رہے تھے اور نئی الجھنیں سامنے آ رہی تھیں۔ اقبال نے یہ موقع غنیمت جانا اور وقت کے دھارے سے بالکل الگ ہو کر اسلام کے نظریۂ حیات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور انسانیت کی تشکیل جدید کی فکر شروع کی، یہ ان کا انوکھا کارنامہ ہے۔

پروفیسر عبدالمغنی نے جہاں اقبال کے اسلامی فکر کی تعریف کی ہے اور کہا ہے کہ انھوں نے انسانیت کی تشکیل کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ کامیاب ہونا اور نہ ہونا تو رہنے دیجیے، جرأت کی بات تو یہ ہے کہ اقبال نے اپنی شاعری کے حوالے سے اسلامی فکر کا نعرہ بلند کیا جب حالات ناساز گار تھے۔ پہلی جنگ عظیم اور روس میں اشتراکیت کے فروغ کے بعد کہاں موقع تھا کہ کوئی شاعر اسلامی فکر کا چراغ روشن کر کے آنکھوں کو خیرہ کر دے۔ اقبال کا یہ یقیناً ایک بڑا اقدم تھا اور یہ بھاری پتھر اقبال ہی اٹھا سکتے تھے۔

پروفیسر عبدالمغنی اقبال کی شاعری میں خیال اور الفاظ کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔ ان کے مطابق اقبال کے تصورات استعارات میں ڈھل گئے ہیں اور آواز نغمہ بن گئی ہے، الفاظ معنیٰ کے ساتھ بالکل مربوط ہیں گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب کچھ ڈھلا ڈھلایا ہے اور ثقیل سے ثقیل خیالات ترنم کی ایمائیت اور لطافت کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

> ''اقبال کے نظم فکر ہی کی طرح ان کا اپنا ایک نظام اساطیر بھی ہے، جس کے استعارے، تلمیحیں اور کنائے اپنا ایک مخصوص رنگ و آہنگ رکھتے ہیں اور ان کے اشارات و علامات نے احساسات و جذبات کی ایک خاص الخاص دنیا بسائی ہے۔ اس دنیا کی امتیازی شان یہ ہے کہ یہاں شاعری کی صفت نصب

العین کی فطرت سے کامل طور پر ہم آہنگ ہے۔

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنٰی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی''

(28)

عالمی ادب میں اقبال کا مقام طے کرنے سے قبل پروفیسر عبدالمغنی نے مشرقی ادبیات کے کچھ نامور مشاہیر کی شاعری کے حوالے سے کچھ کہنا ضروری سمجھا تا کہ یہ صاف ہو جائے کہ اردو، فارسی، سنسکرت، بنگلہ اور دوسری زبان میں جو شعری خدمات ہمارے سامنے ہیں، ان کے درمیان اقبال کی شاعری کس مقام پر ٹھہرتی ہے تا کہ اس سے آگے کا مرحلہ طے کرنے میں آسانی ہو۔

پروفیسر عبدالمغنی نے موازنے کے لیے سب سے پہلے فارسی شاعری کے چند بڑے شعرا کا نام لیا ہے جن میں رومی، حافظ، سعدی اور خیام ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ ان میں کوئی شاعر اس درجہ کو نہیں پہنچتا کہ اس کی شاعری کا موازنہ اقبال کی شاعری سے کیا جائے۔ ہاں اقبال کی شاعری کے کسی ایک پہلو سے ان شعرا کی پوری شاعری کا موازنہ کیا جائے یا کیا جا سکتا ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی نے یہ باتیں بڑی جسارت سے کہہ تو دی ہیں لیکن یہ غیر مناسب معلوم ہوتی ہیں۔ اگر اقبال کی شاعری سے ان شعرا کی شاعری کا موازنہ نہیں ہو سکتا ہے تو نہ سہی لیکن یہ کہنا کہ اقبال کی شاعری کے کسی ایک پہلو سے ان کی پوری شاعری کا موازنہ کیا جا سکتا ہے، انتہا پسندانہ معلوم ہوتا ہے۔

رومی کے متعلق پروفیسر عبدالمغنی کہتے ہیں کہ ان کی مثنوی کا حجم بھی کم ہے (حجم کا کم ہونا کوئی بری بات نہیں ہے اور اس سے تخلیق کے معیاری یا غیر معیاری ہونے کی بات ثابت نہیں ہوتی) اور جہاں تک وصف کی بات ہے تو اقبال نے اپنی مثنوی اردو اور فارسی (''ساقی نامہ''، ''اسرار خودی'' اور ''رموز بے خودی'') میں وقیع اضافہ کیا ہے۔ حافظ کے متعلق ان کا خیال ہے کہ حافظ کے دیوان کا موازنہ اقبال کے ''پیام مشرق'' کے ''باب غزلیات''، ''مے باقی'' سے کر لیا جائے تو حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ ''زبور عجم'' اور ''بال جبریل'' کی غزلیں تو حافظ کی غزلوں سے بہت آگے نکلی ہوئی ہیں۔ خیام کی رباعیات ''پیام مشرق'' کے حصۂ رباعیات کے ساتھ ملا کر پڑھی جائیں تو یہ عجیب و غریب نکتہ دریافت ہوگا کہ اقبال کی فکر انگیزی میں خیام کی عیش کوشی سے زیادہ آب و تاب اور

انبساط ونشاط ہے۔سعدی کا موازنہ شعریت میں اقبال کے ساتھ کرنا کوئی بہت موزوں بات نہیں ہے۔ جہاں تک دانشوری کا تعلق ہے تو اقبال کے اجتماعی تصورات سعدی کی شخصی اخلاقیات سے بہت ممتاز ہیں اوران کی آفاقی اہمیت واضح ہے۔

اس طرح پروفیسرعبدالمغنی نے فارسی کے شعرارومی، حافظ، سعدی اور خیام کی شاعری کو اقبال کی شاعری سے موازنہ کے قابل نہیں سمجھا لیکن ان شعرا کی بعض خوبیوں کا اعتراف ضرور کیا ہے۔مجموعی طور پران کی نگاہ میں فارسی شعرا کی تخلیقات اس لائق نہیں ٹھہرتیں کہ ان کا موازنہ اقبال کی شاعری کے ساتھ کیا جائے۔

فارسی کے چند مستند شعرا کے بعد پروفیسرعبدالمغنی اردو کے دومعروف شعرا میؔر وغالبؔ کے تعلق سے کہتے ہیں کہ میؔر وغالبؔ نے اردوشاعری کو جو وسعت عطا کی تھی اقبال اس سے بہت آگے لے گئے ہیں۔میؔر کے تعلق سے ان کا یہ بیان کہ میؔر کی شاعری میں دل ربائی کے سوا کچھ نہیں اوران کا فنی تجربہ ابتدائی قسم کا تھا،محلِ نظر کہا جا سکتا ہے۔ پروفیسرعبدالمغنی غالبؔ کو تھوڑی اہمیت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن ان کی شاعری میں ناہمواریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال کی توصیف کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ غالبؔ کے یہاں جو کچھ ناہمواریاں تھیں ان کو اقبال نے دور کر کے نفاست بیاں کا ایک بہتر معیار قائم کیا ہے اور معانی کے تنوع اور تخیل کی وسعت میں تو اقبال کا موازنہ میؔر وغالبؔ کے ساتھ کرنا ہی فضول ہے۔

پروفیسرعبدالمغنی کے ذریعہ میؔر وغالبؔ سے اقبال کی شاعری کا موازنہ راقم الحروف کی نظر میں اس لیے غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فکری سطح پر میؔر وغالبؔ کا میدان الگ اور اقبال کا الگ ہے لہذا اس موازنہ کو بہت بامعنی نہیں کہا جا سکتا۔

میؔر وغالبؔ کے بعد پروفیسرعبدالمغنی نے سنسکرت کے کالی داس اور عربی کے شاعر امرأالقیس کا نام گنوایا ہے اورانہیں بھی قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ظاہر ہے جب فارسی اور اردو کے شعرا پروفیسرعبدالمغنی کی نگاہ میں قابل اعتنا نہیں ٹھہرے تو پھران دونوں شعرا کے متعلق بھی ان کی رائے خلاف توقع نہیں معلوم ہوتی۔الغرض پروفیسرعبدالمغنی نے یہ واضح کر دیا ہے کہ مشرقی ادب میں جتنی اور جیسی بھی شاعری ہوئی ہے،اسے اقبال نے عروج بخشا اور کمال تک پہنچا دیا ہے۔لہذا مشرقی شعرا سے ان کا موازنہ کرنا درست نہیں ہے۔اب تک مشرقی ادب میں جو اضافہ ہوا ہے،ان سب

کی تجدید اور توسیع اقبال نے کی ہے۔اس لیے اقبال کا موازنہ عربی ادیبوں ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ بنگلہ ادب میں سب سے بڑا نام رابندر ناتھ ٹیگور کا ہے لیکن ان کی شاعری سے بھی پروفیسر عبدالمغنی مایوس ہیں۔ان کے خیال میں ٹیگور کی شاعری تھکے ہوئے ذہنوں کے لیے وقتی فرحت کا سامان مہیا کرتی ہے اور وہ ہمارے ذہن کو سلاتے ہیں جب کہ اقبال جگاتے ہیں۔ ٹیگور کا کلام کائنات کی حرکت کو ایک نقطے پر جامد دیکھنا چاہتا ہے جب کہ اقبال کا کلام حرکت اور زندگی کو نئی الجھنوں سے مقابلہ کرنے کے لیے حوصلہ عطا کرتا ہے۔اس طرح مشرقی ادب کے تمام مشاہیر کے تعلق سے پروفیسر عبدالمغنی کے خیالات کم و بیش یکساں ہی ہیں۔ان میں کسی کی شاعری ایسی نہیں کہ اقبال کا موازنہ کیا جا سکے۔مغربی مشاہیر کی شاعری کے تعلق سے پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

> ''عالمی سطح پر تین شعرا ایسے ہیں جن کے ساتھ اقبال کا موازنہ کرنے سے ادبیات عالم میں اقبال کا مقام واضح ہوجائے گا۔ ایک اطالوی شاعر دانتے (1321 - 1365) دوسرے انگریزی شاعر شیکسپیئر (1564-1616) تیسرے جرمن شاعر گوئٹے (1749-1832) یہ تینوں شعرا وہ ہیں جو نہ صرف مغربی ادبیات کے سرخیل سمجھے جاتے ہیں بلکہ اہل مغرب نے انہیں پوری دنیا کے بہترین و عظیم ترین شعرا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے''۔(29)

اطالوی شاعر دانتے کے متعلق پروفیسر عبدالمغنی کا خیال ہے کہ ان کی شاعری میں دور تک جانے کی صلاحیت نہیں تھی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں فکری و ادبی روایات میں کوئی ایسا خاص مسئلہ درپیش نہیں آیا جس سے ان کے فن میں وسعت پیدا ہوتی اور ان کی شاعری میں مسئلہ بہت معمولی ہے۔تخیل و فکر کے لحاظ سے ''ڈوائن کامیڈی'' ان کی بہترین تصنیف ضرور ہے لیکن وہ اتنی اہم نہیں ہے کہ اس کا موازنہ اقبال کے ''جاوید نامہ'' سے کیا جائے۔''جاوید نامہ''، ''ڈوائن کومیڈی'' سے بہت آگے کی چیز ہے۔

پروفیسر عبدالمغنی شیکسپیئر کا موازنہ اقبال سے کرتے ہوئے، شیکسپیئر کے ڈراموں اور ان میں پیش کیے گئے کرداروں کی تو تعریف کرتے ہیں اور انہیں ڈرامانگاری کا ماہر کہنے میں بھی انھیں کوئی تامل نہیں لیکن ان ڈراموں میں مکالموں کے لیے جو شاعری استعمال کی گئی ہے اگر اسے ڈراموں سے نکال کر یک جا کیا جائے اور اس شاعری کا

موازنہ اقبال کی شاعری سے کیا جائے تو بقول پروفیسر عبدالمغنی اقبال کی شاعری شیکسپئیر کی شاعری سے بہت آگے نکلتی ہوئی معلوم ہوگی۔ شیسکپیئر کا مجموعی کلام بھی اقبال کی شعری تخیلات سے بہت کم ہوگا۔ اس طرح شیکپیئر کا موازنہ بھی اقبال سے غیر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

جرمن شاعر گوئٹے کے متعلق پروفیسر عبدالمغنی کا خیال ہے کہ گوئٹے دانتے اور شیکسپیئر کے مقابلے میں موازنہ کے لیے کچھ زیادہ مضبوط شاعر ہیں جن کا موازنہ اقبال سے کیا جا سکتا ہے۔ گوئٹے کی شاعری بھی دانتے اور شیکسپیئر سے زیادہ ہے لیکن مجموعی طور پر غور کیا جائے تو یہاں بھی نتیجہ کچھ زیادہ برعکس نظر نہیں آتا اور اقبال کی شاعری کی خوبیاں جن کی وجہ سے اقبال واقعی اقبال ہوئے ہیں گوئٹے کی شاعری میں دیکھنے کو نہیں ملتیں۔ گوئٹے اپنی پوری شاعری میں روایت سے نہیں نکل سکے اور ایک رومان زدہ شاعر بن کر رہ گئے۔ گوئٹے کی شخصیت کا سفلہ پن ان کے مشہور ڈرامے ''فاوسٹ'' کے واقعات واحساسات سے معلوم ہو جاتا ہے، خواہ اس کو اعتراف جرم کی ایک عبرت انگیز دستاویز ہی کیوں نہ سمجھا جائے۔ پروفیسر عبدالمغنی کے خیال میں گوئٹے منتشر خیالات کے شاعر تھے اور ان میں فنی معروضیت کا بھی کوئی مستقل معیار نہیں ملتا، جب کہ اقبال کی خوبیاں سب پر عیاں ہیں۔

پروفیسر عبدالمغنی کی نظر میں عالمی ادب میں اقبال جس مقام پر فائز ہے اس کا علم ہمیں ان کے درج ذیل اقتباس بخوبی ہو جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> ''اقبال کے پیش نظر شاعری کے ذریعے ایک نصب العین کی ترجمانی تھی۔ جب کہ دانتے، شیکسپیئر اور گوئٹے کے سامنے اتنا سنجیدہ اور پیچیدہ کوئی تصور نہیں تھا۔ اس طرح برخلاف اپنے ہم صف دوسرے شعرا کے، اقبال پر فکر کا دباؤ انتہائی حد تک بڑھا ہوا تھا۔ اس صورت حال کے باوجود اقبال نے شاعرانہ ایمائیت کے جس کمال کا ثبوت دیا ہے، وہ دنیائے ادب میں ایک نادر اور بے نظیر واقعہ ہے۔ بلاشبہ دانتے کے پاس بھی مسیحیت کا تصور تھا اور گوئٹے بھی کچھ افکار رکھتا تھا جن میں مسیحی قدریں بھی شامل تھیں اور ان اقدار فکر کا سراغ شیکسپیئر کے تخیل میں بھی ملتا ہے۔ مگر نصب العین کی وہ محیط باضابطگی جو اقبال نے اسلامی نظریۂ کائنات اور حیات کی صورت میں اختیار کی وہ کسی دوسرے شاعر کے یہاں قطعاً نہیں پائی جاتی''۔(30)

اس طرح پروفیسر عبدالمغنی نے عالمی ادب میں اقبال کا مقام ایک طرح سے طے کر دیا ہے اور اپنی مفصل گفتگو اور دلائل سے وہ ایک حد تک ہمیں مطمئن کر دیتے ہیں کہ واقعی عالمی ادب میں اقبال کو اعلیٰ مقام حاصل اور موجودہ ادب میں اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔

اقبال اور ان کی شاعری پروفیسر عبدالمغنی کا محبوب موضوع رہا ہے اور انھوں نے اقبال کی شاعری کے تمام پہلوؤں کا تفصیلی تجزیہ کیا ہے۔

اخیر میں مجموعی طور پر اقبال کی نظمیہ شاعری ہو، غزلیہ شاعری ہو، رباعیات ہوں، مثنویات ہوں یا پھر تمام اصناف

میں ان کی فکر یکساں ہے گویا انھوں نے جو چراغ روشن کیا تھا اس کی لو مدھم نہیں ہوئی اور چہار طرف اس کی روشنی پھیلتی چلی گئی۔ پوری اردو دنیا میں اقبال کی شاعری پر جتنا اور جس قدر اظہار خیال ہوا ہے، اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ یہاں ان کی اردو شاعری کے حوالے سے ایک اقتباس نقل کر کے اس باب کا اختتام کیا جا رہا ہے۔

> ''اقبال کا تصور عشق رومانیت کی خوب صورت ترین تعبیر ہے۔ تاہم ان کے عظیم موضوعات، شائستہ اسلوب، عظمت تاریخ کا گہرا احساس اور غیر شخصی انداز پیش نظر رکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ اقبال کی شاعری کسی لااُبالی ذہن کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کے پس پشت سالہا سال کا تفکر، مطالعے کی گہرائی، علم جدید کا مطالعہ اور ان کا گہرا عالمانہ تجزیہ اپنا اثر و عمل بروئے کار لا رہا ہے''۔(31)

حواشی

(1)فروغ تنقید، مصنف عبدالمغنی، مطبوعہ ایم۔ کے آفسیٹ پرنٹرس دہلی، اشاعت 1988، ص 6

(2)تنویر اقبال، مصنف عبدالمغنی، مطبوعہ زاہد بشیر پرنٹرس لاہور، اشاعت 1990، ص 7

(3)تشکیل جدید، مصنف عبدالمغنی، مطبوعہ دی آرٹ پریس سلطان گنج پٹنہ، اشاعت 1772، ص جیم

(4)تصورات، مصنف عبدالمغنی، مطبوعہ لکشمی پریس دریا گنج دہلی، اشاعت 1988، ص 105

(5)ایضاً

(6)فروغِ تنقید، پروفیسر عبدالمغنی، مطبوعہ ایم کے آفسٹ پرنٹرس نیو دہلی، 1988، ص 50

(7) ایضاً، ص 55

(8)ایضاً، ص 57

(9)ایضاً، ص 74

(10)ایضاً، 75

(11)اقبال بہ حیثیت شاعر، مصنف پروفیسر رفیع الدین ہاشمی، مطبوعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، 1996، ص 58 ,57

(12)اقبال کا نظام فن، مصنف عبدالمغنی، مطبوعہ اقبال اکیڈمی پاکستان، اشاعت 1990، ص 180

(13)جادۂ اعتدال، مصنف عبدالمغنی، مطبوعہ کتاب منزل سبزی باغ پٹنہ، اشاعت 1972، ص 33

(14)مضمون بہ عنوان ''اقبال کی شاعری کا انسانی پہلو، ڈاکٹر عبادت بریلوی، مشمولہ تفسیر اقبال، مرتب بہار الہ آبادی، مطبوعہ جمال پریس، اشاعت 1982، ص 378

(15)اسلوب تنقید، مصنف عبدالمغنی، مطبوعہ عاکف بک ڈپو دہلی، اشاعت 1989، ص 235

(16)ایضاً، ص 238

(17)اقبال اور عالمی ادب، پروفیسر عبدالمغنی، مطبوعہ اقبال اکیڈمی پاکستان، 1982، ص70

(18)ایضاً، ص84

(19)ایضاً، ص439

(20)اقبال کا نظام فن، مصنف عبدالمغنی، مطبوعہ اقبال اکیڈمی پاکستان، اشاعت 1990، ص441

(21)اقبال کا نظریۂ خودی، مصنف عبدالمغنی، مطبوعہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، اشاعت 1990، ص14

(22)ایضاً، ص15

(23)ایضاً، ص18

(24)ایضاً، ص19

(25)ایضاً، ص230

(26)ایضاً، ص230

(27)اقبال شاعر اور فلسفی، مصنف وقار عظیم، مطبوعہ اسرار کریمی پریس الہ آباد، اشاعت 1975، ص166

(28)اقبال اور عالمی ادب، مصنف عبدالمغنی، مطبوعہ اقبال اکیڈمی پاکستان، اشاعت 1990، ص567

(29)ایضاً، ص571

(30) ایضاً، ص577

(31) اقبال کے کلاسکی نقوش، مصنف انور سدید، مطبوعہ اقبال اکیڈمی پاکستان، اشاعت 1988، ص111

﴾ اختتامیہ ﴿

اختتامیہ

پروفیسر عبدالمغنی ایک بلند پایہ نقاد انشاء پرداز، بہار اردو تحریک کے سپہ سالار اور اردو کو بہار کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلانے میں ان کا مرکزی کردار رہا ہے۔ ان کو اردو، عربی، فارسی، انگریزی چاروں زبانوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ ان کی پیدائش صوبۂ بہار ضلع اورنگ آباد میں 4 جنوری 1936 میں ہوئی۔ ان کا پورا نام ''ابو المبر دسید عبدالمغنی'' ہے لیکن ادبی دنیا میں عبدالمغنی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم والد ماجد کی نگرانی میں مدرسہ اسلامیہ اورنگ آباد میں ہوئی۔ 1960ء میں پٹنہ یونی ورسٹی سے انگریزی ادب میں M.A کیا اور پھر وہی سے T.S ELIOT'S CONCEPT OF CULTURE کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر PH.D کی ڈگری حاصل کی۔ پٹنہ میں اردو بھون کی تعمیر انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی چھ بار انجمن ترقی اردو بہار کے صدر رہ چکے ہیں۔ 1968 میں انھوں نے انجمن ترقی اردو بہار کے ترجمان کی حیثیت سے ایک ماہنامہ ادبی رسالہ ''مریخ'' کے نام سے جاری کیا۔ جو ادبی تحقیق کی دنیا میں دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

پروفیسر عبدالمغنی کو ادب سے عشق رہا وہ اسے تزئین حیات کا بہت بڑا وسیلہ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جس معاشرے کا ادب خراب ہو جاتا ہے اس کا دل و دماغ بھی سلامت بھی نہیں رہتے۔ اسی طرح جس قوم کی شاعری، افسانہ، ڈرامہ، ناول اور تنقید منصفانہ نہ ہو اس قوم کو کسی طرح بھی صحت مند نہیں سمجھا جا سکتا۔ پروفیسر عبدالمغنی ادب کو فنون لطیفے کی اعلیٰ ترین شکل مانتے ہیں۔ وہ ادب کے بغیر مہذب انسانیت کا تصور ناممکن قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ادب دو عناصر کا مرکب ہے، ایک فکر دوسرا فن۔ وہ فکر و فن کے درمیان کامل اعتدال اور توازن کی وکالت کرتے ہیں۔ فن پارے میں ایک طرف فکر کی استقامت دوسری طرف فن کی جمالیات دونوں کو ایک دوسرے کے برابر، بلکہ ایک دوسرے میں اس درجہ پیوست کہ حامی مانتے ہیں کہ من وتو کا کوئی فرق باقی نہ رہے۔ اس طرح یہ ادبی کل اپنے قاری کو بیک وقت مسرت اور بصیرت، نشاط و آرزو اور کاوش کا سامان فراہم کرتی ہے۔ انھی سب باتوں کے مدنظر انھوں نے تنقید ادب کی طرف قدم اٹھایا۔

ان کے نزدیک اردو تنقید میں تجزیہ وتبصرہ کے نمایاں اسالیب، مارکسی،نفسیاتی، جمالیاتی،تاثراتی اور متنی تنقید ہیں جو سبھی ناقص ہیں۔ان کے پاس نہ زندگی کا ایک کلی ومتوازن نظریہ ہے اور نہ ادب کا۔ یہ سارے اسالیب ادب اور زندگی کے صرف بعض پہلوؤں اپنی توجہ مرکوز کرتی ہیں اور اس میں انتہا پسندی،غلواور مبالغہ کرتے ہیں۔اس عدم اعتدال کے سبب ان اسالیب کے ذریعہ کیے گئے تمام تجزیہ وتبصرے مجموعی طور پر ادبی فن پارے کو غلط شکل میں پیش کرتے ہیں۔جس سے ادب کا ایک مغالطہ آمیز تصور ابھرتا ہے۔جس سے ذوق وشعور کی تربیت کم اور تخریب زیادہ ہوتی ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی ایک ادیب اور ایک شاعر کو ہمیشہ ایک ادیب اور شاعر کی حیثیت سے لیے ہیں ان کی تنقید میں ذاتیات کا کوئی دخل نہیں ہے۔حتی الوسیع تخلیق کار کے فن کا معروضی تجزیہ کر کے عوامل وعناصر دریافت کرتے ہیں۔فن پارے کو ادب کے مجموعی روایات کے پس منظر میں رکھ کر اس کی نوعیت حقیقت اور اہمیت پر بحث کرتے ہیں پھر اپنے خاص تنقیدی موقف سے معروف ومسلم انسانی واخلاقی قدروں کی روشنی میں فن پارے کے متعلق ادب اور تہذیب کی تاریخ میں فن پارے کا مقام تعین کرتے ہیں۔ پروفیسر عبدالمغنی کا ماننا ہے کہ نئ تنقید کو اپنی قدریں اپنے کلاسکی ادب اور اس کی تہذیبی قدروں کو تلاش کرنا چاہیے۔تنقید کی زبان وبیان وہ ہو جو اردو معاشرے کی جانی پہچانی ہو۔

پروفیسر عبدالمغنی اپنے تنقیدی نظریات میں اخلاقی قدروں پر زور دینے کے ساتھ ساتھ اپنے ادبی رجحانات کو مذہبی رجحانات سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے۔ان کا خیال ہے کہ جس طرح ٹی۔ایس ایلیٹ اور میتھیو آرنلڈ نے اپنی آخری عمر میں اپنے تنقیدی نظریات کو عیسائیت سے جوڑ دیا ہے ٹھیک اسی طرح اسلامی نظریات کا اردو ادب پر نقش ہونا ضروری ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی ادب کی ہزار ہا سالہ تاریخی مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جتنے بھی عالمی ادبی شاہکار ہیں وہ اپنے ماخذ کے اعتبار سے مذہبی رجحانات وتحریکات سے وابستہ ہیں۔مغربی ادبیات کی لاثانی و لافانی تصانیف دانتے کی ''ڈوائن کومیڈی'' گوئٹے کا ''فاوسٹ'' اور ملٹن کی ''فردوس گم شدہ'' اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

پروفیسر عبدالمغنی فکری اعتبار سے اقبال کے بہت قریب ہیں اور اسلامی ادب کو مثبت اور تعمیری ادب تسلیم کرتے ہیں۔ پروفیسر عبدالمغنی کو ایک فوقیت یہ حاصل ہے کہ ان کی پسندیدہ اخلاقی قدریں عیسائیت جیسے رد کردہ نظام

حیات کے مقابلے میں ایک زیادہ مکمل اور جدید نظام حیات یعنی اسلام سے رشتہ رکھتی ہیں۔اس کے باجود بھی وہ ادب پاروں کی اہمیت اور عظمت کا تعین دین اسلام کی اخلاقی قدروں سے ہم آہنگ ایک مخصوص اخلاقی معیار سے کرتے ہیں، اور یہ کوئی عیب نہیں ہے۔ کیوں کہ ٹیگور کی شاعری ویدانیت، اقبال کی شاعری میں اسلام اور ٹی۔ایس ایلیٹ کی شاعری اور تنقید میں ان کے ادبی کاوشوں کے نمونے کے لیے کوئی عیب نہیں ہیں تو ٹھیک اسی طرح پروفیسر عبدالمغنی تنقید میں اسلام ایک وصف ہوسکتا ہے عیب نہیں۔

پروفیسر عبدالمغنی تنقید کے میدان کا ایک معتبر نام ہے۔اب تک ان کے غالباً ایک درجن کے قریب تنقیدی تصانیف کا مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ان کی تصانیف کی کل تعداد تقریباً پچاس کے قریب پہنچتی ہے۔تنقید میں ان کی اصل پہچان اقبال شناس کے طور پر ہے۔انھوں نے اقبال کی شناسی کے نئے زاویے و نقطۂ کا انکشاف کیا، اقبالیات کے تعلق سے ایک نئی فکر و جہت سے آشکار کرایا جس سے ادبی دنیا خاص طور پر مطالعہ اقبال میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ اقبال کا نظام فن، اقبال کا نظریہ خودی، اقبال اور عالمی ادب، اقبال کا ذہنی وفنی ارتقا، تہذیبوں کا تقابلی مطالعہ فکر اقبال کی روشنی میں اور انگریزی میں اقبال دی پوئٹ وغیرہ تصانیف اقبال شناسی کے نئے پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔اس سلسلے میں ان کی سب سے اہم اور شاہکار تصنیف اقبال اور عالمی ادب ہے۔ یہ کلیم الدین احمد کی کتاب ''اقبال ایک مطالعہ'' کا جواب ہے۔اس میں انھوں نے کلیم الدین احمد کے کارناموں کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ بلکہ خاص طور پر ''اقبال ایک مطالعہ میں اقبال کا جو ناقص مطالعہ اور فریب کارانہ انداز تنقید اختیار کیا ہے۔اس کا تحلیل و تجزیہ کرکے دنیا کے سامنے نمایاں کیا ہے۔ وہیں انگریزی کے استاد ہونے کی وجہ سے یہ کتاب عالمی ادب خصوصاً انگریزی ادب کا بھرپور جائزہ اور اس کے مقابلے میں اقبال کے مرتبہ و مقام پہ ایک مستقل بحث ہے جو بیک وقت ادب کے عالمی تصورات اور کلام اقبال کے فنی و فکری مضمرات کا احاطہ کرتی ہے۔

مطالعۂ اقبال یعنی اقبال کے فکر و فن کا مطالعہ پچھلی نصف صدی میں اس کثرت سے کیا گیا ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ اب اقبال کا کوئی بھی پہلو باقی نہیں رہ گیا ہے۔اس کے وجود پر وفیسر عبدالمغنی کا ماننا ہے کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اقبالیات کا کوئی گوشۂ تاریک میں نہیں رہ گیا ہے لیکن حقیقت کچھ اور ہے، اقبال علم و فن کے ایک ایسا سمندر کا م ہے جس کی تہہ سے ابھی جتنے موتی نکالے گئے ہیں تقریباً اتنے ہی موتی اور تہہ میں پڑے ہوئے ہیں۔

مشرقی شعراء مثلاً میرؔ، غالبؔ، کالی داسؔ، ٹیگورؔ، امرأالقیسؔ، حافظؔ، سعدیؔ، اور خیامؔ بشمول رومیؔ کے علاوہ مغربی شعراء میں دانتے، شیکسپیئر اور گوئٹے سے مقابلہ کے بعد وہ اقبال کو صرف دو بنیادوں پر دنیائے شاعری کی سب سے اہم شخصیت ثابت کیے ہیں۔

اول یہ ہے کہ اقبال نے مشرقی و مغربی تمام ہی ادبیات کی بہترین اور عظیم ترین تجربات کو اپنے منفرد تخلیقات کو ترتیب دیکر ایک بہترین اور عظیم ترین فن کاری کا ثبوت دیا ہے۔ دوم اقبال نے اسلامی فکر کی تشکیل جدید اس انداز سے کی ہے کہ عہد حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے سراسر آفاقی سطح پر پیش کیا ہے یعنی اقبال نے اسلامی اصولوں کی ترجمانی عصر حاضر کی اصطلاحات میں کیا ہے۔

ایک تنقید نگار کی حیثیت سے پروفیسر عبدالمغنی کی ایک الگ پہچان ابھر کر آتی ہے۔ کلیم الدین احمد، احتشام حسین، آل احمد سرور اور گوپی چند نارنگ جیسے ہم عصر ناقدین کے درمیان انھوں نے نا صرف الگ پہچان بنائی ہے بلکہ ان کے نظریات سے اختلاف کرتے ہوئے اردو تنقید کو ایک نئے نقطۂ نظر اور معیار و اقدار سے روشناس کرایا ہے۔ رومانی تنقید، نفسیاتی تنقید، تاثراتی تنقید، ترقی پسند یا مارکسی تنقید، جدید تنقید اور مابعد جدید نیز ساختیاتی تنقیدی انتہا پسندیوں کے برخلاف انھوں نے ایک جادۂ اعتدال اختیار کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے اور جب کہ آج تنقید کے میدان میں ہر نقاد اپنے آپ کو ایک دبستان تنقید ثابت کرنے میں لگا ہوا ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی کی تنقید کے مطالعے کے دوران اس بات کا بھی احساس ہوتا ہے وہ خود کہیں کہیں جادۂ اعتدال سے ہٹ کر اپنی بات منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی باتیں آئینے کی طرح شفاف ہیں اور تنقید میں شفافیت کے قائل ہیں۔ مجموعی طور پر پروفیسر عبدالمغنی کو مشرقی نقاد اور تہذیبی و اخلاقی قدروں کے پاسدار ادب میں کلاسکیت کے قائل پاتے ہیں۔ المختصر پروفیسر عبدالمغنی کی تنقید کو ہم مشرقی تنقید یا اخلاقی تنقید کا نام دے سکتے ہیں۔

پروفیسر عبدالمغنی کی تنقید کی ایک خوبی ان کا اسلوب ہے وہ تنقیدی زبان استعمال کرتے ہیں طرز تحریر میں لاپرواہی نہیں برتی جاتی، لفظوں کے استعمال کا خصوصی خیال رکھتے ہیں کسی کی گرفت کے سلسلے میں ایسے فقروں کا استعمال کرتے ہیں جو اخلاقی حدود کے اندر ہوتے ہیں اور صبر وضبط سے کام لیتے ہیں، شگفتہ بیانی ان کا طرۂ امتیاز

ہے۔ بالعموم ان کی تحریر تصنع سے پاک ہے، رواں دواں فقروں میں ایک خاص قسم کی تازگی محسوس ہوتی ہے اور اسلوب میں تسلسل پایا جاتا ہے۔لیکن جب وہ اسلام کی بات کرتے ہیں تو جوش میں آجاتے ہیں اوراپنے جزباتی وابستگی کی وجہ سے اسلامیت کے افادی پہلوؤں پر طویل بحث کرتے ہیں جہاں خطابت کا رنگ غالب آجاتا ہے۔ بلا شبہ یہ بات کھٹکتی ہے پھر وہ دوسرے نقادوں کی طرح نعرے بازی پر نہیں اترتے جیسا کہ مارکسی نقادوں کے یہاں یہ عام کمزور ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی اپنی وسعت علمی ونظری کے سبب خالص تنقیدی شعور رکھتے ہیں۔وہ اپنے تجزیاتی عمل کے ذریعے ادنیٰ واعلیٰ پست و بلند کا معیار قائم کرتے ہیں نثری وشعری اقتباسات موقع ومحل کے لحاظ سے استعمال کرتے ہیں۔گرچہ وہ انگریزی زبان وادب کے استاد ہیں اور انگریزی زبان وادب کا خاصا مطالعہ رہا ہے لیکن تنقیدی میدان میں وہ اس نقالی کو جائز نہیں سمجھتے۔ان کی تنقید ادبی اعتدال کے ساتھ ساتھ حیات وکائنات کے ٹھوس مسائل وحقائق سے بھی اپنا رشتہ استوار کرتی ہے۔ان کے تنقیدی افکار میں سنجیدگی اور متانت ہے تو طرز بیان میں نفاست، لطافت اور شفافیت کی خوبیاں موجود ہیں۔وہ اپنے فکری قماش میں ان کی تنقید میں خواجہ الطاف حسین حالی، امداد امام اثر، مسعود حسین رضوی ادیب، کلیم الدین احمد، احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری کا سا وزن اور وقار رکھتی ہے۔ان کا اسلوب نگارش محمد حسین آزاد، آل احمد سرور، اختر اورینوی کے طرز بیان سے قریب ہے۔ان کے یہاں فکر واسلوب دونوں شیر وشکر ہوگئے ہیں۔ پروفیسر عبدالمغنی کی تنقید ادبی تنقید کے افادی نظریہ وعمل ایک واضح نکتہ ہے۔

کتابیات

کتابیات

	اسماء مصنف/مرتب	اسماء کتب	مطبوعہ	اشاعت
1	آل احمد سرور	دانشور اقبال	ایم ۔ کے آفسیٹ، دہلی	2002
2	آفاق احمد	اقبال آئینہ خانے میں	گورنمنٹ سینٹرل پریس بھوپال	1979
3	انور سدید	اقبال شناسی اور ادبی دنیا	بزم اقبال، کلب روڈ، لاہور، پاکستان	1988
4	اعجاز علی ارشد	بہار میں اردو تنقید	دی آرٹ پریس، پٹنہ 6	1981
5	بہار الہ آبادی	تفسیر اقبال	جمال پرنٹنگ پریس، دہلی	1982
6	توقیر احمد خان	اقبال کی شاعری میں پیکر تراشی	برنی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی	1989
7	جمیل جالبی، ڈاکٹر	تاریخ ادب اردو	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ	2016
8	خدا بخش اورینٹل لائبریری	غالب، اقبال اور ٹیگور	خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ	1999
9	خلیفہ عبدالحکیم	فکر اقبال	اسرار کریمی پریس، الہ آباد	1977
10	رفیع الدین ہاشمی، پروفیسر	اقبال بہ حیثیت شاعر	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ	1996
11	سید احمد قادری، ڈاکٹر	پروفیسر عبدالمغنی حیات اور خدمات	پاکیزہ آفسیٹ شاہ گنج، پٹنہ	2005
12	سید احتشام حسین	تنقید اور عملی تنقید (ایڈیشن دوم)	اتر پردیش اردو اکیڈمی	2005

13	سلطان آزاد	دبستان عظیم آباد	لکھار پریس، مئو، یو پی	1982
14	شبیر امام	ڈاکٹر عبدالمغنی ایک سوانحی جائزہ		
15	طاہر تونسوی	اقبال اور مشاہیر	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی	1981
16	طاہر فاروقی	اقبال اور محبت رسول ﷺ	اقبال اکیڈمی، پاکستان	2009
17	عبدالمغنی، پروفیسر	نقطۂ نظر	کتاب منزہ سبزی باغ، پٹنہ	1965
18	عبدالمغنی، پروفیسر	جادۂ اعتدال	کتاب منزہ سبزی باغ، پٹنہ	1972
19	عبدالمغنی، پروفیسر	تشکیل جدید	دی آرٹ پریس، سلطان گنج، پٹنہ	1976
20	عبدالمغنی، پروفیسر	معیار و اقدار	حکمت پبلیکیشنز، پٹنہ	1981
21	عبدالمغنی، پروفیسر	تنقید مشرق	اردو بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی	1987
22	عبدالمغنی، پروفیسر	تصورات	لکشمی پریس دریا گنج، نئی دہلی	1988
23	عبدالمغنی، پروفیسر	اسلوب تنقید	عاکف بک ڈپو مٹیا محل، دہلی	1989
24	عبدالمغنی، پروفیسر	تنویر اقبال	زاہد بشیر پرنٹرس، لاہور	1990
25	عبدالمغنی، پروفیسر	تنقیدی زاویے	ثمر آفسیٹ پرنٹرس نئی دہلی	1993
26	عبدالمغنی، پروفیسر	فروغ تنقید	ایم۔ کے آفسیٹ پرنٹرس، نئی دہلی	1998
27	عبدالمغنی، پروفیسر	اندازِ تنقید	کراؤن آفسیٹ سبزی باغ پٹنہ	2007
28	عبدالمغنی، پروفیسر	اقبال اور عالمی ادب	اقبال اکیڈمی، پاکستان	1982
29	عبدالمغنی، پروفیسر	اقبال کا نظام فن	دی آرٹ پریس، سلطان گنج، پٹنہ	1984
30	عبدالمغنی، پروفیسر	اقبال کا نظریۂ خودی	لبرٹی آرٹ پریس، دریا گنج	1990
31	عبدالمغنی، پروفیسر	اقبال کا ذہنی وفنی ارتقا	ثمر آفسیٹ پرنٹرس، نئی دہلی	1991
32	عبدالمغنی، پروفیسر	تہذیبوں کا تقابلی مطالعہ فکر اقبال کی روشنی میں	خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ	2001

33	عبدالماجد سالک	ذکر اقبال (ایڈیشن دوم)	مکتبہ جدید پریس، لاہور	1983
34	عبدالرحیم خان	جہان اقبال	انجمن ترقی اردو ہند	2006
35	عبادت بریلوی	اردو تنقید کا ارتقا	انجمن ترقی اردو، کراچی	2011
36	عبادت بریلوی، ڈاکٹر	تنقیدی زاویے	مکتبہ اردو لاہور	1950
37	عبدالحق، ڈاکٹر	تنقید اقبال اور دوسرے مضامین	جمال پرنٹنگ پریس، دہلی	1976
38	عبدالسلام ندوی	اقبال کامل		
39	فرمان فتح پوری	اقبال سب کے لیے	اردو اکیڈمی سندھ، کراچی	1978
40	کلیم الدین احمد	اقبال ایک مطالعہ	جمال پرنٹنگ پریس، دہلی	1979
41	کوثر مظہری	مظہر جمیل	عرشیہ پبلیکیشنز دہلی	2014
42	گوپی چند نارنگ	اقبال کا فن	گلوب آفسیٹ پریس، دہلی	1983
43	محمد سالم	زاویۂ خیال	لیبل آرٹ پریس، شاہ گنج، پٹنہ	1985
44	محمد سالم	زایۂ نگاہ	لیبل آرٹ پریس، شاہ گنج، پٹنہ	
45	محمد شفیع الزماں، ڈاکٹر	عبدالمغنی اردو کی ایک عبقری شخصیت	پاکیزہ آفسیٹ شاہ گنج، پٹنہ	2013
46	محمد اقبال جاوید	علامہ اقبال کی اردو شاعری میں تلمیحات و استعارات	ایجوکیشن بک ہاؤس، علی گڑھ	2015
47	نورالحسن نقوی، پروفیسر	تاریخ ادب اردو	ایجوکیشن بک ہاؤس، علی گڑھ	2014
48	وقار عظیم	اقبال شاعر اور فلسفی	اسرار کریمی پریس، الہ آباد	1975
49	یوسف حسن خان، ڈاکٹر	روح اقبال	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی	1966

رسائل وجرائد

	اسماء ایڈیٹر	اسماء رسائل	مقام اشاعت	سن اشاعت
1	امتیاز احمد کریمی	بھاشا سنگم (سہ ماہی) مشاہیر نمبر حصہ دوم	محکمہ راجیہ بھاشا، حکومت بہار	اکتوبر 2017 تا مارچ 2018
2	عبدالباری، سید، ڈاکٹر	پیش رفت (ماہ نامہ)	2703 بارہ دری، بلی ماران، دہلی 6	دسمبر 2007/2005
3	نوشاد مومن، ڈاکٹر	مژگاں (سہ ماہی) بہار کا معاصر ادب نمبر جلد اول	21BC علیم الدین اسٹریٹ، دوسری منزل کولکاتہ	جنوری تا دسمبر 2017
4	نعیم صدیقی	سیارہ (سالنامہ)	لاہور	2007